سیلاب اشک

مؤلف
میر اسحاق امرتسری

سیلابِ اشک

محمد امین اثر

جنت دوزخ کی باتوں کو دیر و حرم تک رہنے دو
اپنی گلی کی۔ اپنے نگر کی۔ اپنے وطن کی بات کرو

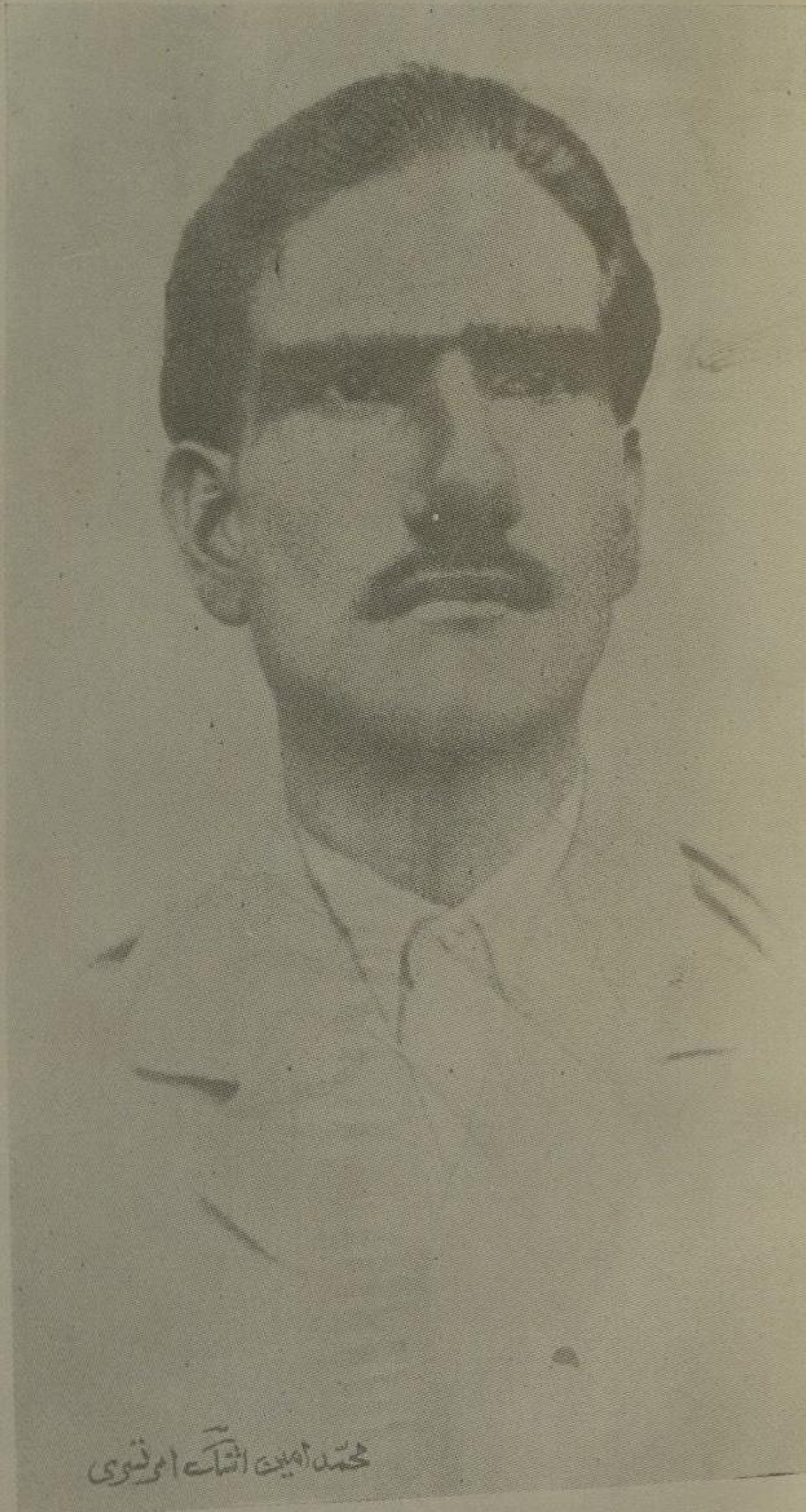
ناشر : محمد اسحاق امرتسری۔ کراچی

پرنٹر : ملک محمد عارف

مطبوعہ: دین محمدی پریس لاہور

قیمت : پانچ روپے

فہرست



محمد امین اشک امرتسری

حرفِ اوّل

حرفِ اول

محمد امین اشک کی قومی شاعری کا دور بھارت سے ہماری ہجرت کے بعد ۱۹۵۰ء سے شروع ہوا۔ اور ۱۹۵۵ء میں ختم ہو گیا۔ تقسیم مملکت کے وقت وہ ہم سب کے ساتھ کلکتہ سے لاہور نہ آسکے اور وہیں بھارت میں انقلاباتِ روزگار کا تماشا دیکھتے رہے۔ اس افتراق کے باوجود وہ اپنا کلام بالالتزام ہمیں بھیجتے رہے۔ اور انکی خط و کتابت کا سلسلہ مجھ سے اور چھوٹے بھائی محمد سلیم سے برابر جاری رہا۔

۱۹۵۰ء سے ان کا کلام کلکتہ اور دہلی کے روزناموں اور ماہناموں میں چھپنے لگا۔ جن کے تراشے وہ اپنے مکتوبات کے ساتھ ہمیں بھی بھیجتے رہے۔ اور اسی زمانہ سے وہ صحیح معنوں میں خلوت

سے جلوت میں آ گئے۔ جانبازوں اور سرفروشوں کے کارواں میں شریک ہو گئے۔ قومی جلسوں، ادبی مجلسوں، طرحی اور غیر طرحی مشاعروں میں شریک ہونے لگے، مقامی ادیب شاعر اور دانشور اُن کے گرد سمٹ آئے۔ اور اُن سے والہانہ محبت کرنے لگے۔ عوام میں اُن کا کلام بہت مقبول ہوا۔ اور انہیں لفظاً و معناً بھارت میں دورِ حاضر کا بے بدل قومی شاعر تسلیم کر لیا گیا۔ کالجوں اور اسکولوں کے طلبا اور مزدوروں اور قومی انجمنوں کے رضاکار جلسوں اور جلوسوں میں اُن کے ترانے دیوانہ وار پڑھنے لگے۔ اور نظیر اکبر آبادی کے اندازِ بیان کی مشابہت کے سبب اُن کے نام کے ساتھ "نظیر العصر" وغیرہ لکھا جانے لگا مشاعروں کا اسلوب فکر بدل گیا۔ گلشن شعر و ادب میں اک سنئے انداز کی بہار آئی۔ اور اپنے دیرپا نقوش چھوڑ گئی۔

۱۹۵۵ء میں وہ کینسر کے موذی مرض کی لپیٹ میں آ گئے۔ اور ۱۹۵۶ء میں تقریباً چالیس سال کی عمر میں اِس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔ وہ مجھ سے پندرہ برس چھوٹے تھے۔ اشکؔ مرحوم کے بعد اُن کی رفیقۂ حیات النوری بیگم بھی اسی کینسر کے مرض میں اللہ کو پیاری ہوئیں۔ اُن کے کوئی اولاد نہیں تھی۔

رہے نام باقی بس اللہ کا

بڑے بھائی خواجہ عزیزالدین کے نوجوان فرزند محمد مستقیم کی شہادت تو تقسیم مملکت کی خونریز جھڑپوں میں جشنِ آزادی کی صبح کو امرتسر سے ہجرت کی راہ میں واقع ہو ہی چکی تھی۔ جس کا داغ متعلقین کے سینہ میں ہنوز مندمل نہیں ہوا تھا۔ کہ اُس کے بعد چھوٹے بھائی محمد امین اشک نے بھی بھارت ہی میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ اور یہ صدمہ بھی حالات کی خصوصی نوعیت کے باعث اہلِ خاندان کے لئے بالخصوص بے حد صبر آزما رہا۔

زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

۱۹۶۵ء میں اشکؔ مرحوم کے دوستوں اور قدردانوں نے اُنکے کلام کے کچھ اجزا جو ادھر اُدھر سے انہیں فراہم ہو سکے "سیلِ اشکؔ" کے نام سے کتابی صورت میں شائع کر دیئے اور یہ کتاب کسی نہ کسی طرح اب ۱۹۷۰ء میں عزیزی سید سرفراز خالد کی نوازش سے میرے پاس بھی پہنچ گئی خالد صاحب ڈھاکہ میں کسی بہت بڑی کمپنی کے مینجر ہیں۔ اور کمپنی کے کاروباری سلسلہ میں کلکتہ بھی آتے جاتے رہتے ہیں۔ کبھی کبھار کراچی آتے ہیں تو مجھ سے بھی مل لیتے ہیں۔ یہ کتاب وہ کلکتہ سے لائے تھے۔ جو انہوں نے براہ کرم عاریتاً مجھے دیدی۔

کتاب کو دیکھ کر مرحوم کی رحلت کا زخم پھر ہرا ہو گیا۔ پرانی یادیں پھر تازہ ہو گئیں۔ مرحوم کے کلام اور دیگر ملفوظات کا پلندہ میرے پاس بھی

گھر کے کسی تاریک طاقچہ میں پڑا تھا۔ مگر اُسے چھُونے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ اُس میں کچھ بجلی کے سے تار تھے جن سے دل پر جھٹکا لگتا تھا۔ چوٹ لگتی تھی۔ اب وہ سب ملفوظات اندھیرے سے اجالے میں آگئے۔ اور بجلی کے تاروں کا کرنٹ کسی اور طرف کو مُڑ گیا۔ مرحوم کے دوستوں کے جذبۂ خدمت خلق اور ولولۂ بزم آرائیٔ شعر و سخن سے آنکھیں پُر نم اور دل باغ باغ ہو گیا۔

اکنوں کرا دماغ کہ پُرسد زِ باغباں
بلبل چہ گفت و گل چہ شنید و صبا چہ کرد

"سیل اشک" کو ادھر اُدھر سے دیکھا۔ اُس میں وہی سب مرحوم کے قلمی جواہر پارے جگمگا رہے تھے۔ جو دیکھے بھالے تھے۔ ہر نظم معاشرہ کے حالات واقعی کا آئینہ تھی۔ بے نواؤں اور بے روزگاروں کی زندگی کے ماحول اور ان کے پس پردہ جذبات و احساسات کی ہُو بہو تصویر تھی۔ اک آگ کا سیلاب تھی۔

مگر یہ دیکھ کر قلق ہوا۔ کہ مرحوم کی بہت سی گراں بہا نظمیں اُس میں نہیں تھیں۔ لیلائے جوانی، اے میرے وطن واہ، ٹی بی اور کینسر، شراروں سے کھیلئے، نادان دیکھ، بڑھے چلو، یہ سب کچھ اس میں نہیں تھا۔ ظاہر ہے کہ ان تمام نظموں کے مسودے ناشرین کو نہیں مل سکے۔

"لیلائے جوانی" کی نظم غالباً بھارت کے بھی کسی رسالے میں نہیں

چھپی۔ اس کے متعلق جناب اشک خود لکھتے ہیں کہ "بغیر نظر ثانی کے آپ کے پاس بھیج رہا ہوں"۔ مگر بغیر نظر ثانی بھی وہ نظم بے مثل تھی۔ مثلاً یہ بند کہ ہر ذرۂ صحرا میں ہے صحرائے جوانی

صحرا کی جوانی ہے کہانی ہی کہانی
دریا کی جوانی ہے مچلتا ہوا پانی
شاعر کی جوانی ہے فقط چرب زبانی
قوموں کی جوانی ہے حقیقت میں جوانی

جس سے کہ دہل جاتی ہے دنیائے جوانی

قوموں کی جوانی ہے قدامت کیلئے موت
ہر دور کے شداد کی جنت کیلئے موت
ہر عہد کے قارون کی دولت کیلئے موت
فرعون کے آئین حکومت کے لئے موت

جس موت سے دنیا کی پلٹ آئے جوانی

"کلکتہ کی بہار" روزنامۂ عصر جدید کلکتہ میں چھپ چکی تھی اُس کے بھی دو بند سیل اشک میں نہیں تھے۔ جن میں کا ایک بند یہ ہے۔

جب شہر میں محنت سستی ہو، دیہات میں مہنگا غلہ ہو
جب شہر خموشاں بستی ہو، مرگھٹ کا نام محلہ ہو

تقدیر ہنر پہ ہنستی ہو، تقصیر کا بھاری پلّہ ہو
گاہک کو آنکھ ترستی ہو، فٹ پاتھ پہ پھرتا ہلّہ ہو
قانون کا ناگ اچھلتا ہو، تب دیکھ بہار کلکتہ

"روٹی" کی نظم میں بھی کئی بند کم تھے۔ کئی شعر مفقود تھے۔ مثلاً

روٹی ہے جس کے پیٹ میں بچی ہے اُس کی بات
بھوکا ہے گر۔ تو جھوٹا ہے۔ بکتا ہے واہیات
سنتا نہیں ہے کوئی بھی اُس بد نصیب کی
گلتی نہیں ہے دال کہیں بھی غریب کی

اِن سب نظموں کی اشاعت کی دھن سر میں سمائی اور خیال پیدا ہوا کہ یہ سب غیر مطبوعہ کلام بھی خدمت خلق کی خاطر چھاپ دیا جائے اور پاکستانی شعر و ادب کے سبزہ زاروں میں نشر کر دیا جائے۔

مگر صاحبدلے روزے برحمت
کند در حقِ آں مسکیں دعائے

یعنی :۔ کوئی اللہ کا بندہ کسی دن۔ اُسے دینے لگے دل سے دعائیں

اور یا پھر صاف صاف لفظوں میں یوں کہیئے۔

نکل آئیں دلِ صاحبدلاں سے
جناب اشک کے حق میں دعائیں

اور مرحوم کی دردناک نوائیں بھارت کے لالہ زاروں سے اڑ کر پاکستان کے سبزہ زاروں میں گشت کرنے لگیں اور اس وادِ خوش نہاد کے درد مندوں کے دل و جگر میں تیر و نشتر کی طرح اتر جائیں۔ اِس خیال کے آتے ہی بہت سی رنگین نظمیں مرتب ہو گئیں۔ اور سیل اشک کے آگے پیچھے سیلاب اشک بھی امنڈ آیا۔

سیلاب اشک کیلئے تبصرہ کی تلاش غیر ضروری تھی۔ جناب پرویز کا تبصرہ پہلے ہی سے موجود تھا۔ اُسے بھی زینتِ کتاب کر دیا گیا۔ سیل اشک کے بھی کچھ اقتباسات شامل کر دیئے گئے۔ اپنی بھی دو تین متعلقہ نظمیں منسلک کر دی گئیں۔ مرحوم کی ایک عکسی تصویر اور دو تین مکتوبات کی فوٹو اسٹیٹ کاپیاں بھی پریس والوں کے حوالہ کر دی گئیں اور یوں جوں توں یہ کتاب منظرِ عام پر آ گئی۔

اس سلسلہ میں جناب حاجی محمد صاحب کا ذکر بھی ضروری ہے۔ کہ وہ بھی برضا و رغبت سیلاب اشک کی طباعت و اشاعت پر آمادہ ہو گئے۔ اور اُن کے دین محمدی پریس کی مدد سے ہماری بہت ساری مشکلیں آسان ہو گئیں۔ الغرض جناب پرویز اور جناب خالد اور جناب حاجی محمد صاحب کے علاوہ انجمن ترقی اُردو ہند بھی ہمارے شکریہ کی مستحق ہے کہ اِن سب کی مساعی جمیلہ کے بغیر یہ سب تیر و نشتر نوائیں

صدا بصحرا ہو جائیں:۔

آخر میں جناب اشک مرحوم کے لئے ہم پھر دعا مغفرت کرتے ہیں کہ:۔

جس توقع پہ تھی اپنی زندگی وہ مٹ گئی!
جو بھروسا تھا ہمیں وہ آسرا جاتا رہا!

مؤلف
اسحاق امرتسری
۵۔ای۔ بلاک ایف۔ شمالی ناظم آباد
کراچی۔ ۲۔ نومبر ۱۹۷۰ء

اے میرے وطن واہ

اے میرے وطن میرے وطن میرے وطن واہ
اے میرے وطن واہ
یہ ارض و سما صبح و مسا گنگ و جمن واہ!
یہ وادی صحرا و جبل دشت و دمن واہ
یہ ساغر و گل سبزہ و گل سرو و سمن واہ
آزادیِ نو اور یہ آئینِ کہن واہ!!!
اے میرے وطن میرے وطن میرے وطن واہ
اے میرے وطن واہ
دریا ترے مواج ہیں شاداب کنارے
ذرے ہیں تری خاک کے گردوں کے ستارے
ہر گوشۂ صحرا میں ہیں جنت کے نظارے
ماتم کدۂ فصل بہاراں ہے چمن واہ
اے میرے وطن میرے وطن میرے وطن واہ
اے میرے وطن واہ

ہے تیری زمین مست زماں مست فضا مست
محلوں کے کلس مست ہیں بنکوں کی ہوا مست
مندر میں صنم مست ہیں مسجد میں خدا مست
اور بندۂ مزدور ہے کٹیا میں مگن واہ
اے میرے وطن میرے وطن میرے وطن واہ
اے میرے وطن واہ

یہ نظم و نسق طرز و روش خوب ہے کیا خوب
ہیں عشق و جنوں زشت و زبوں حرص و ہوا خوب
ہر اوج فضیلت ہے پئے اہلِ خطا خوب
مردانِ حق آگاہ کی گردن میں رسن واہ
اے میرے وطن میرے وطن میرے وطن واہ
اے میرے وطن واہ

یہ جسم کی حالت ہے کہے تو کہ نہیں روح
سو عجز سے ہر در پہ جھکاتی ہے جبیں روح
بکتے ہیں کہیں دل کہیں دانش تو کہیں روح
اور طوق و سلاسل سے ہیں آزاد بدن واہ
اے میرے وطن میرے وطن میرے وطن واہ

اے میرے وطن واہ

اے ارضِ وطن عظمتِ جمہور کی سوگند
ہم جامۂ صد چاک میں ہیں خرم و خورسند
اور اطلس و کمخواب ہے پوشاکِ خرے چند
مزدور کی میت بھی ہے بے گور و کفن واہ
اے میرے وطن میرے وطن میرے وطن واہ
اے میرے وطن واہ

یہ میرا وطن میرا وطن میرا وطن ہاں
بے شک رشکِ جنت تھا کل اب غیرتِ زنداں
ہنگامۂ قلقل ہے نہ بلبل ہے غزل خواں
ہر شاخ پہ ہیں ہرزہ سرا زاغ و زغن واہ
اے میرے وطن میرے وطن میرے وطن واہ
اے میرے وطن واہ

یہ حالِ وطن دیکھ کے میں چپ رہوں کیسے
اے اشک ابھی اٹھتے ہیں شعلے تری لے سے
بے شک تو سنوارے گا اسے ایک دن ایسے
بے ساختہ فرمائیں گے اربابِ سخن واہ!

اے میرے وطن میرے وطن میرے وطن واہ
اے میرے وطن واہ

کارواں رُکتا نہیں

شورشِ باطل سے دب سکتی نہیں آوازِ حق
یورشِ خاشاک سے سیلِ رواں رکتا نہیں
شورِ بے ہنگام کی پروا نہ کر، اے راہرو
بھونکتے رہتے ہیں کتے کارواں رکتا نہیں

بڑھے چلو

مثالِ بوئے بوستاں ۔ برنگِ موج بے کراں
بہار رَوِش غبار ساں ۔ قدم قدم رواں دواں
بڑھے چلو بڑھے چلو

وہ سوز و سازِ عاشقی ۔ وہ راہ و رسمِ دوستی
وہ زندگی وہ سرخوشی ۔ یہ نعمتیں یہاں کہاں
بڑھے چلو بڑھے چلو

تمام عمر سیر کی ۔ حرم کی اور دیر کی !
خبر ملی نہ خیر کی ۔ بس ایک شر ہے جاوداں
بڑھے چلو بڑھے چلو

جنوں زندہ ہے آدمی ۔ جنون بھی ہے مذہبی
کہ حبس کی تہ میں تیرگی ہے کفر بیز و شر فشاں
بڑھے چلو بڑھے چلو

کہیں ہے بندۂ خدا ۔ نشانِ قبر پر فدا
کہیں ہے گائے دیوتا ۔ یہ دین ہے کہ چیستاں
بڑھے چلو بڑھے چلو

یہ مذہبی جماعتیں ۔ یہ دائمی رقابتیں
یہ دوزخی خباثتیں ۔ ہیں زہر بیز و شر فشاں
بڑھے چلو بڑھے چلو

تمہیں کہو یہ حادثے ۔ ہیں کفر کے کہ دین کے
جلے ہوئے یہ جھونپڑے ، لٹی ہوئی یہ بستیاں
بڑھے چلو بڑھے چلو

یہ آدمی ہے آدمی ۔ کہ آدمی کی لاش سی
یہ نوحہ خواں ہے زندگی کہ چیختی ہیں ہڈیاں !
بڑھے چلو بڑھے چلو

یہ زہد کا غرور ہے کہ عقل کا فتور ہے !
یہ اوجِ مکر و زور ہے کہ الحفیظ والاماں
بڑھے چلو بڑھے چلو

یہ شیخ اور برہمن ۔ مجددانِ علم و فن !
کفن کھسوٹ راہزن ہیں گھات میں جہاں تہاں
بڑھے چلو بڑھے چلو

عنانِ فکر موڑ دو ۔ یہ قید و بند توڑ دو
بس اب یہیں یہ چھوڑ دو توہمات کے نشاں

بڑھے چلو بڑھے چلو

قدم بڑھاؤ دوستو۔ اب اُس دیار کو چلو
جہاں نہ ڈر نہ خوف ہو۔ نہ زندگی کی تلخیاں
بڑھے چلو بڑھے چلو

جہاں دوئی کی بو نہ ہو۔ جہاں کوئی عدو نہ ہو
فریب ماد تو نہ ہو۔ جہاں ہو عشق حکمراں
بڑھے چلو بڑھے چلو

جہاں نہ ہو مہاجنی جہاں ہو ہر بشر غنی!
جہاں دلوں کی روشنی۔ سے جگمگائیں بستیاں!
بڑھے چلو بڑھے چلو

جہاں سدا بہار ہو۔ سکون ہو قرار ہو!
کنار جوئبار ہو۔ اور آسماں ہو مہرباں
جہاں ہو اشک زندگی۔ اک انبساط دائمی
جہاں فقط ہنسی خوشی میں ہو نجات انس و جاں
بڑھے چلو بڑھے چلو

قدم قدم رواں دواں
بڑھے چلو بڑھے چلو

کھیلئے

پھولوں سے کھیلئے نہ بہاروں سے کھیلئے
شعلوں سے بجلیوں سے شراروں سے کھیلئے

آسان نہیں ہے بحرِ محبّت میں کھیلنا
کشتی الٹ کے موت کے دھاروں سے کھیلئے

یا مہر و مہ بنائے ذرّاتِ خاک کو
یا آسماں کے چاند ستاروں سے کھیلئے

ساحل کی حد میں قید رہے گی نہ زندگی
سیلِ فنا کی طرح کناروں سے کھیلئے

جائز نہیں ہے آتشِ نمرود سے گریز
مثلِ خلیلؑ سرخ شراروں سے کھیلئے

ہے دشتِ کربلا میں وہی خاک و خوں کا کھیل
تنہا جنابِ اشکؔ ہزاروں سے کھیلئے

مانا کہ ہار جیت مقدّر سے ہے مگر
جینے کی آرزو ہے تو "زاروں" سے کھیلئے

جب تک کہ دم میں دم ہے نہ کیجے یہ کھیل بند
گر ہاتھ ٹوٹ جائیں اشاروں سے کھیلئے

اُٹھا رہا ہے گرا رہا ہے

ازل سے ابتک یہ قصۂ غم ہزار عُنواں بدل چکا ہے
میں کہہ رہا ہوں وہ سُن رہے ہیں۔ نہ ابتدا ہے نہ انتہا ہے

یہ وقت بھی وقت امتحاں ہے۔ یہ دور بھی دور ابتلا ہے
وہی تگ و تاز خیر و شر ہے۔ وہی بیابانِ کربلا ہے

یہ دل ہے پروردۂ تلاطم یہ موجِ طوفاں سے کھیلتا ہے
رہے گی ساحل سے دور کشتی اگر یہ کشتی کا ناخدا ہے

نہ کوئی ہمراز و ہم زباں ہے نہ کوئی ہمدم نہ ہمنوا ہے
یہ چار تنکے ہیں آشیاں کے اب اور گلشن میں کیا دھرا ہے

رہِ وفا میں ہے شرط ہمت ہزار پُر پیچ راستا ہے
تلاش کر لیگی اُس کو منزل جو فکرِ منزل میں کھو گیا ہے

ابھی مذبذب ہیں اہلِ دانش مگر یہ دانش کا فیصلہ ہے
تمام عالم وہ راز ہے جو نہ کھل سکیگا نہ کھل سکا ہے

نہ چرخ چکر میں ہے نہ سورج زمین کے گرد گھومتا ہے
یہ کوئی معشوق ہے جو پردہ اٹھا رہا ہے گرا رہا ہے

بہارِ گلشن لٹی ہوئی ہے چراغِ محفل بجھا ہوا ہے
قفس کی تاریکیوں میں اشکؔ خراب و خستہ غزل سرا ہے

○

کہو کیوں نہ ایسے میں وہ یاد آئیں

مہکتی ہوئی چل رہی ہوں ہوائیں
تھرکتی ہوئی تتلیاں گنگنائیں
نظارے شراب محبت پلائیں
نظر تھرتھرائے قدم ڈگمگائیں

کہو کیوں نہ ایسے میں وہ یاد آئیں

ترنم سے معمور ہوں جب فضائیں
ترانے مسرت کے طائر سنائیں
دفور طرب سے شجر جھوم جائیں
جھما جھم برستی ہوں کالی گھٹائیں

کہو کیوں نہ ایسے میں وہ یاد آئیں

بہت دور سے آرہی ہوں صدائیں
کہ آؤ تو آنکھوں سے آنکھیں لڑائیں
محبت کے ساغر میں یوں ڈوب جائیں
کہ ڈھونڈیں ہمیں لوگ لیکن نہ پائیں

کہو کیوں نہ ایسے میں وہ یاد آئیں

بہاریں نئے نت شگوفے کھلائیں
گلوں کو سرِ آنکھوں پہ کانٹے بٹھائیں
چٹک کر جو کلیاں ذرا مسکرائیں
لچک کر یہ شاخیں گلے سے لگائیں

کہو کیوں نہ ایسے میں وہ یاد آئیں

سرِ راہ اے اشک جب دل چرائیں
کسی شعلہ رو کی بھڑکتی ادائیں
کہاں جائیں ہم اور کہاں دل چھپائیں
سنبھالیں تقدس کہ تقویٰ بچائیں

کہو کیوں نہ ایسے میں وہ یاد آئیں

○

لیلائے جوانی

کو کھنیچ گئی تصویر سراپائے جوانی
محمل سے نکل آئی ہے لیلائے جوانی
دیکھو ہے یہی چہرۂ زیبائے جوانی
پرکھو ہے یہی گوہر یکتائے جوانی
سونچو ہے اگر تم کو بھی دعوائے جوانی

بے شک یہ جوانی ہے کہ سانچہ میں ڈھلی ہے
نقاش ازل کا یہی نقش ازلی ہے
موجوں کے تھپیڑوں میں طمانچوں میں پلی ہے
طوفان کی آغوش میں یہ پھولی پھلی ہے
گرداب حوادث بکفِ پائے جوانی!

ہر دور میں ہر حال میں شاداں ہے جوانی
رقصاں ہے فروزاں ہے درخشاں ہے جوانی
ہنگامہ بکف حشر بداماں ہے جوانی
ہے مرگ خزاں۔ جانِ بہاراں ہے جوانی

سکّانِ فلک محو تماشائے جوانی

جب ذرۂ ناچیز پر آتی ہے جوانی
کس طرح جلال اپنا دکھاتی ہے جوانی
صحرا سے بگولوں کو بھگاتی ہے جوانی
خاشاک سے طوفان اٹھاتی ہے جوانی

ہر ذرۂ صحرا میں ہے۔ صحرائے جوانی

صحرا کی جوانی ہے کہانی ہی کہانی
دریا کی جوانی تو ہے چڑھتا ہوا پانی
شاعر کی جوانی ہے فقط چرب زبانی
قوموں کی جوانی ہے حقیقت میں جوانی

جس سے کہ دہل جاتی ہے دنیائے جوانی

اے دوست جوانی ہے بہت ارفع و اعلیٰ
بہہ جائے گا سیلاب جوانی میں ہمالہ
ہو جائے گا یہ نظم جہاں کا تہہ و بالا
اور شرق سے تا غرب اجالا ہی اُجالا

سچ پوچھو تو کچھ بھی نہیں بالائے جوانی

موسیٰ کی جلالت ہے جوانی کے عصا میں

پنہاں ید قدرت ہے جوانی کی قبا میں
گہوارۂ عظمت ہے جوانی کی ہوا میں
ہنگامہ حیرت ہے جوانی کی فضا میں
فرمانِ بغاوت ہے تقاضائے جوانی

قبضہ میں جوانی کے ہے یہ عالم امکاں
پنجہ میں جوانی کے ہے یہ گردش دوراں
اور مرگ جوانی ہے یہ آغوش حسیناں
ہشیار نہو جائیں کہیں خاک میں غلطاں
لعل و گہر و لولو و لالائے جوانی

اے مرد جواں دیکھ - اِدھر دیکھ اُدھر دیکھ
شیرازۂ قوت نہ کہیں جائے بکھر دیکھ
اربابِ زر و سیم کے یہ فتنہ و شر دیکھ
یہ ذلت و رسوائی اربابِ ہنر دیکھ
صد حیف اگر حسن میں کھو جائے جوانی

اے مرد جواں، دل نہ جواں ہو تو عبث ہے
بالائے یقیں، وہم و گماں ہو تو عبث ہے
جرأت کی جگہ، آہ و فغاں ہو تو عبث ہے

گر جہد و عمل - بارِ گراں ہو تو عبث ہے
ایسا ہے تو بے کیف ہے صہبائے جوانی

یہ رُت یہ سماں اور یہ جوانی کی بہاریں
روحوں کو جو گرمائیں خیالوں کو سُدھاریں
ہر گام پہ جذبات کو اُکسائیں اُبھاریں
افسانوں سے کترائیں حقیقت کو پکاریں
دیرینہ روایات کو ٹھکرائے جوانی

ظاہر ہے کہیں اور کہیں مستور جوانی
حیدر، کہیں خالد کہیں منصور جوانی
رستم کہیں۔ ارجن کہیں لندھور جوانی
القصہ کہیں نار کہیں نور جوانی
یونہی نہیں ہر دور میں غوغائے جوانی

قوموں کی جوانی ہے قدامت کیلئے موت
ہر دور کے شدّاد کی جنّت کیلئے موت
ہر عہد کے قارون کی دولت کیلئے موت
فرعون کے آئینِ حکومت کے لئے موت
جس موت سے دنیا کی پلٹ آئے جوانی

فتح و ظفر و نصرت و اقبال جوانی
عزم و عمل و عظمت و اجلال جوانی
ہرگز نہیں پابندِ مہ و سال جوانی
اے اشک جوانی ہے بہرحال جوانی
ہے جھرّیوں میں نقش کفِ پائے جوانی

تضمین

پیغامِ عمل

(اسحاق امرتسری کی نظم پر تضمین)

منقلب ہونے کو ہر نقش جہاں بیتاب ہے
قطرۂ شبنم میں بھی کیفیتِ سیماب ہے
سنگریزوں میں ضیائے گوہرِ نایاب ہے
مسلمِ خوابیدہ اُٹھ یہ خواب کیسا خواب ہے
اُٹھ کہ روشن تیرے سر پر مہرِ عالمتاب ہے

اک ذرا تجدید کر کے دیکھ ذوقِ دید میں
زندگی کی ندیاں ہیں وادیِ خورشید میں
کامرانی کے ثمر ہیں گلشنِ امید میں
اُٹھ کہ نغمے مضطرب ہیں بربطِ توحید میں
اُٹھ کہ سازِ دینِ فطرت تشنۂ مضراب ہے

دیکھ مسجودِ ملائک۔ سُن تو اے عالم پناہ
باعثِ تکوینِ عالم فخر سے کر کج کلاہ
منتظر تیری نگاہِ شوق کے ہیں مہر و ماہ

اٹھ کہ پھر کونین کے ہیں دیدہ و دل فرشِ راہ
اٹھ کہ تو وجہ بقائے عالم اسباب ہے

بستیاں خاموش ہیں سُونے پڑے ہیں میکدے
رک گئے ہیں راہ میں گم کردہ منزل قافلے
اُٹھ کے پھر بیدار کردے زندگی کے ولولے
اٹھ رباب کُن فکاں میں روحِ مستی پھونک دے
اٹھ کہ بے صہباو ساقی محفل احباب ہے

اُٹھ کہ بحرِ زندگی ہے مرکزِ برق و بلا
اُٹھ کہ غافل ناخدا ہے اور طوفاں ہے بپا
اُٹھ کہ پھر مردانِ حق ہیں مبتلائے ابتلا
اُٹھ کہ پھر آتش فشاں ہے کارزارِ کربلا
اُٹھ کہ پھر روحِ حسین ابن علی بے تاب ہے

اٹھ کے کردے عالم ظلمات کو زیر و زبر
اٹھ کے کردے مختلف اقوام کو شیر و شکر
اٹھ ذرا ہمت دکھا باطل کی کثرت سے نہ ڈر
اُٹھ متاعِ سرفروشی راہ حق میں پیش کر
اُٹھ کہ پھر ایماں کا جوہر گوہرِ نایاب ہے

اُٹھ خدا کے واسطے اٹھ تا بہ کے یہ گو مگو
اُٹھ کے پھر تخمِ محبت ارضِ کیں پر وریں بو
اُٹھ کہ ظاہر تجھ سے اعجازِ خلیل اللہ ہو
اُٹھ بنا دے گلشنِ حق آتشِ نمرود کو
اُٹھ کھُلا تیرے لیئے خلد بریں کا باب ہے

اُٹھ کہ پھر قلب مسلماں میں ہے ایماں کی کمی
اُٹھ کہ اٹھتی جا رہی ہے رسم صلح و آشتی
اُٹھ کہ پھر اب عاشقانِ دینِ حق پر آبنی
اُٹھ کہ پھر نرغے میں ہے قومِ رسولؐ ہاشمی
اُٹھ کہ پھر اُمڈا یزیدی فوج کا سیلاب ہے

اُٹھ کہ اُٹھ کر پست کر دیں بجلیوں کے حوصلے
اُٹھ کہ سیلِ اشک سے اُٹھتے ہیں شعلے آگ کے
اُٹھ کہ دنیا جل اٹھی شعر و سخن کے سوز سے
اُٹھ کہ گلشن میں لگا دی آگ نالوں نے مرے
اُٹھ" زمیں سے آسماں تک سوختن کا باب" ہے

بات کرو

حرص و ہوا کی دنیا میں کیوں علم اور فن کی بات کرو
سود و زیاں کی، سیم و طلا کی، مال اور دھن کی بات کرو

ذکرِ غم ہا ہستی نہ کرو، عیش و طرب کی دنیا میں
حُسنِ جواں کی، سرو رواں کی، غنچہ دہن کی بات کرو

جورِ فلک کی بخت زبوں کی باتوں میں کیا رکھا ہے
اہلِ وطن کے عزم و یقینِ تخت شکن کی بات کرو

جنّت دوزخ کی باتوں کو دیر و حرم تک رہنے دو
اپنی گلی کی، اپنے نگر کی، اپنے دھن کی بات کرو

ٹوٹ گیا دمِ دورِ خزاں کا فصلِ بہاراں آتی ہے
غنچہ و گل کی، شیشۂ مُل کی، سرو سمن کی بات کرو

سورج ابھرا، کرنیں پھوٹیں سرخی پھیلی مشرق میں
دفن کہاں ہوں گے یہ اندھیرے گور و کفن کی بات کرو

اشکؔ نہ الجھو اہلِ خرد کی الٹی سیدھی باتوں میں
دل سے دل تک پہنچے گی تم اپنے من کی بات کرو

○

شاعر خانہ بدوش

ہوش کے کانوں سے سن اے شاعر خانہ بدوش
دعوت مے دے رہی ہے تجھکو بزم ناؤنوش

نالۂ وشیون نہ کر رندوں کی مستی دیکھکر
نالہ وشیون نہیں شایانِ شانِ مرد ہوش

دستِ ہمت کو بڑھا مینا اٹھا ساغر اٹھا
عام ہے فیضانِ بزم ساقیِ مینا بدوش

آسماں سر پہ اُٹھالے شورِ محشر کر بپا
سازِ چنگ و نے بزن صہبائے جاں پرور بنوش

اپنی منزل سے بہک کر تو کہاں جاتا ہے دیکھ
تیرے ہی یہ آئینہ خانے ہیں اے خانہ بدوش

چشم بینا کی ترازو میں فرو مایہ نہیں
خسروِ زریں قبا سے بے نوائے دلق پوش

ایک ہی ساغر میں ساقی نے الٹ دی کائنات
زعم باطل ہو گیا امرتسری کا زعم ہوش

(اسحاق امرتسری)

خانہ بدوش

پیغام بنام اسحاق امرتسری

(روزنامہ شیر رنگون میں شائع ہوئی۔ ۱۱-اپریل ۱۹۳۷ء)

"منظور ہے گذارش احوال واقعی"

رغبت اگرچہ شعر و سخن سے نہیں مجھے
اپنا بیاں ہے اپنی زباں اپنا حال زار
نسبت سخن سرائے چمن سے نہیں مجھے
بیزار مجھ سے خاک وطن کس لئے ہے کیا
الفت زمین گنگ و جمن سے نہیں مجھے
بے فائدہ ہے میرے لئے شکوۂ وطن
ممکن نجات رنج و محن سے نہیں مجھے
سچ ہے ہوائے گل سے میں ہوں دور مگر کیا
وابستگی بھی اہل چمن سے نہیں مجھے
رکھتی نہ گردشوں میں اگر زندگی مجھے
"خانہ بدوش" کہتے نہ حضرت کبھی مجھے

○

دار الامان میرا مکان

سر چھپا کر بیٹھ رہنے کے لئے دار الاماں
موڑ پر "چونا گلی" کے اک شکستہ سا مکاں
ایک بوسیدہ چٹائی اور اک لنگڑی سی میز
حال زار بے کساں پر اشکبار و اشک ریز
چند ٹوٹی کرسیاں اور ایک اونچی نیچی کھاٹ
اک ذرا سی بالٹی، ٹوٹا ہوا چھوٹا سا پاٹ
تام چینی کی رکابی اور پیالہ جس کے پاس
ایک مٹی کی صراحی ہے، صراحی پر گلاس
اک پھٹا بوسیدہ کمبل اک پرانی سی دری
چند کپڑے چیتھڑے لادے ہوئے ہے الگنی
کچھ کتابیں کاپیاں، پنسل قلم کاغذ دوات
چند اخبار و رسائل کچھ پرانے کاغذات
کوئلوں کا ڈھیر، حقہ، راکھ تمباکو توا
این ہمہ اسباب خانہ اور اس کے ماسوا
ہر طرف مکڑی کا جالا جا بجا چوہوں کے بل

جھانکتے ہیں روزنِ دیوار سے دِق اور سِل
بھولے بھٹکے گر کبھی اس گھر میں آتی ہے ہوا
سینکڑوں بیماریوں کے "جرم" لاتی ہے ہوا
پُشت پر ہے کارخانہ کی غلاظت اور دھواں
سامنے وہ نالی ہے اور اُس میں بدبو الاماں
یہ جو نالی میں پڑے ہیں چیتھڑے اور دھجیاں
کھیلتے ہیں ان سے بی ہمسائی کے ننھے میاں
موڑ پر رہتی ہے بڑھیا سر چڑھے دھوبی کی ماں
رات دن چلتی ہے قینچی کی طرح جس کی زباں
اور وہ لڑکی جو فلمی گیت گاتی ہے سدا
ٹاٹ کا پردہ ہٹا کر جھانک لیتی ہے ذرا
ایک بیوہ بھی ہے جس کا کوئی بیٹا ہے نہ گھر
کر ہی لیتی ہے گذر کاغذ کے ٹھونگے بیچ کر
چودھری نتھو کا بیٹا رات کو پی کر شراب
گالیاں بکتا ہے لیکن منتخب اور لاجواب
الغرض یہ وہ محلّہ ہے جہاں رہتے ہیں ہم
ہم کہ ہیں دانائے اسرار و رموزِ جام جم

اور لکھیں خانۂ تاریک کی توصیف کیا
موم بتی کے اجالے میں کریں تصنیف کیا
رات دن کرتے ہیں بس حمد و ثنائے کردگار
رحمتیں جس کی ہیں بے حد بے شمار و بے حساب
جس کے اک ادنٰے اشارہ سے نظامِ کائنات
یوں بدل جاتا ہے جیسے رات سے دن، دن سے رات
چاند ہو جاتا ہے شق اور خشک ہو جاتا ہے نیل
آتشِ نمرود بن جاتی ہے گلزارِ خلیل
یہ حقائق ہیں مگر درجہ سکونِ دل نہیں
ذکرِ ماضی مژدۂ تعمیرِ مستقبل نہیں
آ گئی ہے پھر اُسی مرکز پہ کھینچ کر کائنات
"پھر وہی کعبہ ہے یا رب پھر وہی لات و منات"
کیوں کسی کو اب غمِ دنیا و ما فیہا نہیں
سینکڑوں فرعون ہیں اور ایک بھی موسٰی نہیں
آخر اے خلّاقِ عرش و فرش یہ کیا بات ہے
اپنے عالم کا یہ عالم ہے کہ دن بھی رات ہے

ہندی مسلمان

اُونچا پربت گہرا ساگر اور چٹیل میدان
بنجر صحرا بہتا دریا کھیتی اور کھلیان!
ہر گھر میرا کُٹیا ہو یا قصر عالی شان
میرا ہے یہ بھارت سارا۔ میرا ہندستان
سچا مسلمان ہوں میں ہندی مسلمان

میرے دل کا نور ہے میری آنکھ کا تارا دیس
جگمگ جگمگ کرتا ہے انوار سے سارا دیس
جتنا پیارا من ہے مجھکو اتنا پیارا دیس
سچا دین نبی کا میرے سچا ہے قرآن
سچا مسلمان ہوں میں ہندی مسلمان

سن لیں میرے بیری دشمن رہزن دشت دکھٹور
پریم کا بل ہے میرے من میں شیر کا تن میں زور
اتر دکھن پورب پچھم دھوم ہے چاروں اور
کر سکتا ہے کون میرے بھارت کا اپمان
سچا مسلمان ہوں میں ہندی مسلمان

سب سے پہلے دیس میں چمکی ہے مری تلوار
انگریزوں کی نظروں میں ہوں میں پہلا غدار
ابتک جگ میں گونج رہی ہے ٹیپو کی للکار
کون وفا کے بندوں پہ رکھ سکتا ہے بہتان
سچّا مسلمان ہوں میں ہندی مسلمان

اجمل کا اخلاص ہے مجھ میں کچلو کا کردار
مدنی کی عظمت رکھتا ہوں جوہر کے افکار
سیرت ہے آزاد کی جو تھا فطرت کا شہکار
ابتک میرے ساتھ ہیں لاکھوں عبداللہ عثمان
سچّا مسلمان ہوں میں ہندی مسلمان

بھارت کی آزاد فضاؤں میں ہو اب کیا خوف
مجھکو اپنے دیس میں ہو سکتا ہے کس کا خوف
مرجانا جب برحق ہے تو موت سے کیسا خوف
اک دن اپنے دیس پہ مجھکو ہوتا ہے قربان
سچّا مسلمان ہوں میں ہندی مسلمان

مہاتما جی کے نام

ترے ایثار و قربانی کا شاہد ہے جہاں سارا
نہ تابِ دم زدن اس میں نہ کچھ کہنے کا ہے یارا
ہم آنکھیں بند کر کے بہہ گئے اکثر جہاں اور جب
بہا کر لے گیا ہم کو تری تقریر کا دھارا
تجھے معلوم ہونا چاہیئے اے راہبِ اعظم
کہ تیرے قصرِ شہرت میں ہے کس کے خون کا گارا
فقط مزدور کی محنت محبت اور عقیدت سے
ہوا ہے نیّرِ اعظم تری تقدیر کا تارا
مگر اب اس طرح گھیرا تجھے سرمایہ داروں نے
کہ ششدر ہو کے تکتا رہ گیا مزدور بے چارہ
نئے انداز پیدا ہو گئے تیری سیاست میں
کہ اب تو اہلِ زر کے دیدۂ زریں کا ہے تارا
تری روحانیت کا جزوِ اعظم ہو گیا مذہب
اسی باعث ہے دل نیرے پرستاروں کا سی پارہ

رہا تجھکو نہ مزدوروں سے گو کچھ واسطہ لیکن
ابھی تک اُن کے لب پر ہے تری جے کار کا نعرہ
یہ شکوہ بھی نتیجہ ہے محبّت کا غرض یہ ہے
بنالیں پھر تجھے اپنا، منالیں تجھ کو دوبارہ
صدا اب بھی یہ میرے دل کی گہرائی سے آتی ہے
اگر آں "ساحر ہندی" بدست آرد دل مارا
بخال ہندویش بخشم" دیار رود گنگا را"
"کنارِ آب چوپاٹی و گلگشت اپالو را"

○

روٹیاں

کہتے ہیں وہ کہو تو سہی کیا ہیں روٹیاں
کہدو کہ زندگی کا سہارا ہیں روٹیاں
اعجازِ جاں نواز مسیحا ہیں روٹیاں
کم یاب ہیں کہ جانِ تمنّا ہیں روٹیاں

مجھکو فسانہ حضرت آدم کا یاد ہے
گندم بنائے عالم خیر و فساد ہے

روٹی کا ذکر پستیٔ فہم بشر نہیں
خالی ہے ذہن، پیٹ میں روٹی اگر نہیں
یہ رفعتِ نظر ہے۔ فریب نظر نہیں
دو روٹیاں ہیں دوستو شمس و قمر نہیں

حاصل اگر نہوں تو مقدر خراب ہے
انساں ضعیف و پیر بعہد شباب ہے

رکشا کوئی چلاتا ہے روٹی کے واسطے
جوتے کوئی چراتا ہے روٹی کے واسطے
گنگا کوئی نہاتا ہے روٹی کے واسطے

مسجد میں گڑگڑاتا ہے روٹی کے واسطے
روٹی مگر ہے پنجۂ سرمایہ دار میں
اور سب ہیں کنٹرول کے اندر قطار میں

ہاں سچ ہے جان سکتا نہیں سِرِّ کائنات
وہ جس کو پیٹ بھر نہ میسّر ہو دال بھات
روٹی ہے جس کے پیٹ میں، سچی ہے اُس کی بات
بھوکا ہے گر تو جھوٹا ہے، بکتا ہے واہیات
سنتا نہیں ہے کوئی بھی اُس بدنصیب کی
گلتی نہیں ہے دال کہیں بھی غریب کی

باتیں عبث ہیں عالم ظلمت میں نور کی
دھومیں مچی ہوئی ہیں یہاں کذب و زور کی
فاقہ کشی سزا ہے یہاں بے قصور کی
ہوگی نہ سرد آگ شکم کے تنور کی
جب تک نہ چوریاں کھلے بندوں کروگے تم
محنت اگر کروگے تو بھوکوں مروگے تم

روٹی فلک جناب فضیلت مآب ہے
روٹی بغیر آدمی خوار و خراب ہے

روٹی ہے جس کے پاس وہی کامیاب ہے
روٹی بنائے بخشش یوم حساب ہے
خیرات کر کے روٹیوں کے دام لیجیے
دنیا میں عیش، خلد میں آرام لیجیے

جس گھر میں دھوم دھام سے آتی ہیں روٹیاں
سو مکر سو فریب سکھاتی ہیں روٹیاں
تارے فلک کے توڑ کے لاتی ہیں روٹیاں
کم ظرف کو رئیس بناتی ہیں روٹیاں

روٹی کا بھی عجیب ہے حسن کرشمہ ساز
مفلس سے لاگ ڈانٹ۔ تونگر سے ساز باز

بھارت میں چار دانگ ہوا روٹیوں کا کال
زرد و سپید ہو گئے گورے تھے جن کے گال
نان و نمک کے پھیر میں شاعر کا ہے خیال
روٹی نہیں تو غصہ سے آنکھیں ہیں لال لال

ایسے میں لطف خاص حسیناں بھی قہر ہے
روٹی بغیر بادہ و مینا بھی زہر ہے

لٹس کو بعض لوگ سمجھتے ہیں کارو بار
غلّہ بھی اُن کے گھر میں ہے دولت بھی بے شمار
لیکن زمانہ رنگ بدلتا ہے بار بار
کہتی ہے اشکؔ گردشِ گردوں کہ ہوشیار

بھوکے یہ تخت و تاج بھی کھا لیں گے پیٹ میں
سارا جہاں ہے فاقہ کشوں کی لپیٹ میں

تضمین

بہارِ عید نے دل کا کنول کھلایا ہے

نہ فصلِ گُل ہے نہ ابرِ بہار چھایا ہے !
کلی کھلی ہے نہ گُل پر شباب آیا ہے
نہ بلبلوں نے کہیں کوئی گیت گایا ہے
نہ دل جلوں پہ کسی کے کرم کا سایا ہے
یہ کون مژدۂ عیش و نشاط لایا ہے
بہارِ عید نے دل کا کنول کھلایا ہے

شبِ فراق ہے بنیادِ عشق ہلتی ہے
خیالِ وصل سے دل کی خراش چھلتی ہے
غلط کسی کو جہاں میں مراد ملتی ہے
غلط کہ دل کی کلی فصلِ گُل میں کھلتی ہے
کسی نے طنز کیا ہے مذاق اڑایا ہے
بہارِ عید نے دل کا کنول کھلایا ہے

بہت ہی تلخ ہے اے دل حقیقتِ احوال
شکستہ حال ہے بیوی برہنہ تن اطفال

خیالِ خاطرِ احباب اقربا کا سوال
نہ زندگی کا سہارا نہ خودکشی کی مجال
رہا نہ ضبط کا یارا جب اُس نے گایا ہے
بہار عید نے دل کا کنول کھلایا ہے

جہاں زمین ہے نالاں اور آسماں گریاں
گراں ہے نان و نمک اور مردوزن ارزاں
جہاں ہیں نوکِ سناں پر ستمزدہ قصاں
جہاں ہے پنجۂ سرمایہ دار میں انسان
وہیں کسی نے مسرت کا منہ چڑایا ہے
بہار عید نے دل کا کنول کھلایا ہے

نگاہِ لطفِ حسیناں نہ رقصِ بنتِ عنب
شراب و شعر کی محفل نہ بزمِ عیش و طرب
ہلالِ عید ہے گویا نوید رنج و تعب
نہ پوچھ اشکؔ ہوا حال کیا ہمارا جب
کسی نے مصرعِ جانکاہ گنگنایا ہے
بہار عید نے دل کا کنول کھلایا ہے

○

نادان دیکھ

دیکھنے کی چیز یہ دنیا ہے اے نادان دیکھ
کوہ و صحرا بحر و دریا دشت اور میدان دیکھ
نور و نار و حق و باطل کفر اور ایمان دیکھ
قصر عالی شان دیکھ اور خانۂ ویران دیکھ
اس بلند و پست عالم میں خدا کی شان دیکھ
دیکھنے کی چیز یہ دنیا ہے اے نادان دیکھ

چھوڑ ذکرِ آتشِ دوزخ خیالِ حسنِ حور
دیکھ اس دار الفنا میں اجتماعِ نار و نور
قدرتِ حق کے کرشمے ہیں یہاں نزدیک دور
فرصتِ نظارہ تجھکو ہو نہ ہو لیکن ضرور
پیکرِ اضداد یعنی حضرتِ انسان دیکھ
دیکھنے کی چیز یہ دنیا ہے اے نادان دیکھ

دیکھ وہ گلشن جہاں ہر گل ہے جنت در کنار
دیکھ یہ گلخن کہ دوزخ جس میں ہے ادنیٰ شرار

دیکھ وہ ماحول جس میں رقص کرتی ہے بہار
دیکھ یہ عالم سراسر تیرہ و تاریک و تار
یہ جھلستی کھیتیاں وہ زر اُگلتی کان دیکھ
دیکھنے کی چیز یہ دنیا ہے اے نادان دیکھ

سیم و زر کی روشنی میں برقِ غارتگر بھی دیکھ
دانش و حکمت کے پردے میں فروغِ شر بھی دیکھ
کیسۂ تہذیب میں تخریب کے نشتر بھی دیکھ
ایتھر و ایٹم کی دنیا میں علوئے زر بھی دیکھ
ذرۂ ناچیز میں سمٹا ہوا طوفان دیکھ
دیکھنے کی چیز یہ دنیا ہے اے نادان دیکھ

دیکھ دنیا کا تغیر انقلابِ چرخِ پیر
جسم کل بکتے تھے لیکن آج بکتے ہیں ضمیر
دامِ زرینِ ہوس میں ہیں دماغ و دل اسیر
نوعِ انساں کے شکاری ہیں یہ سلطان و امیر
اور یہ سارا جہاں ہے رو کشِ زندان دیکھ
دیکھنے کی چیز یہ دنیا ہے اے نادانِ دیکھ

دیکھ کر رفتارِ گیتی چرخ گرداں بھی ہے دنگ

آدمی کی خوئے خونریزی سے لرزاں ہیں نہنگ
دل میں ہے شوقِ خدائی سر میں ہے سودائے جنگ
ہر طرف ہے افتراقِ دین و مذہب نسل و رنگ
ہو گئی اوہام پر انسانیت قربان دیکھ
دیکھنے کی چیز یہ دنیا ہے اے نادان دیکھ

دیکھ وہ انبارِ زر اور مطمئن سرمایہ دار
دیکھ یہ مردِ جفاکش نامراد و سوگوار
دیکھ وہ بزمِ سرود و رقصِ جامِ زرنگار
دیکھ یہ زندانِ فاقہ کش قطار اندر قطار
سرنگوں بوسیدہ کٹیا سر بلند ایوان دیکھ
دیکھنے کی چیز یہ دنیا ہے اے نادان دیکھ

دیکھ یہ حالات اور حالات کی رفتار دیکھ
تیرگی کی زد میں ہے آئینۂ انوار دیکھ
حسن کی بے چارگی اور عشق کا ادبار دیکھ
ہر قدم پر زندگی ہے موت سے دوچار دیکھ
کھول آنکھیں ہوش میں آ سُن سمجھ پہچان دیکھ
دیکھنے کی چیز یہ دنیا ہے اے نادان دیکھ

دیکھ یہ سب کچھ مگر اے صاحب صدق و یقیں
یاد رکھ تاریکیٔ شب دائمی ہرگز نہیں
جھانکتی ہے رات کے روزن سے صبح دلنشیں
گونجتا ہے دمبدم یہ نغمۂ جان آفریں
انتہائے درد میں ہے درد کا درمان دیکھ
دیکھنے کی چیز یہ دنیا ہے اے نادان دیکھ

آگ

آگ لگی ہے میرے وطن میں میرے وطن میں آگ لگی

موسمِ گل کے آتے آتے صحنِ چمن میں آگ لگی
شاخِ نشیمن جل اٹھی اور سرو وسمن میں آگ لگی
نالۂ بلبل کے شعلوں سے پھول کے تن میں آگ لگی
کوئل کُو کی چھاتی دھڑکی سارے بن میں آگ لگی
آگ لگی ہے میرے وطن میں میرے وطن میں آگ لگی

ذرّہ ذرّہ دوزخ ہے اور پھوٹ رہے ہیں انگارے
قطرہ قطرہ طوفاں ہے اور موت بداماں ہیں دھارے
گوشہ گوشہ زنداں ہے اور دحشت زا ہیں نظارے
قریہ قریہ ویراں ہے اور کوہ و دمن میں آگ لگی
آگ لگی ہے میرے وطن میں میرے وطن میں آگ لگی

آگ تعصب کی ہے جس سے دنیا ساری جلتی ہے
"دولتِ دردِ عشق" ہماری ہو کہ تمہاری جلتی ہے
کشتِ محبت جل اٹھی ہے رحمتِ باری جلتی ہے
شعر اُگلتا ہے شعلے شاعر کے من میں آگ لگی!
آگ لگی ہے میرے وطن میں میرے وطن میں آگ لگی

فرطِ خرد سے اپنا قاتل آپ ہے انساں اُف توبہ
مسخ ہوئی ہے زیست کی صورت موت ہے رقصاں اُف توبہ
خندہ زن ابلیس ہے اور رُو پوش ہے یزداں اُف توبہ
اہلِ زمیں نے بھڑکائی اور چرخِ کہن میں آگ لگی!
آگ لگی ہے میرے وطن میں، میرے وطن میں آگ لگی!

گم ہے صراحی کی گردن میں نغمۂ قلقل، کیا کہیئے؟
موجۂ صرصر کی زد میں ہے باغِ تغزل، کیا کہیئے؟
ختم ہوا ہے ماتمِ گل خاموش ہے بلبل، کیا کہیئے؟
اشکِ حزیں کے نالوں سے نیلائے سخن میں آگ لگی
آگ لگی ہے میرے وطن میں، میرے وطن میں آگ لگی

ٹی۔بی کینسر

حالات کی بخشش جاری ہے
ٹی۔ بی ہے کہیں کینسر ہے کہیں
یہ اپنا اپنا حصّہ ہے
وافر ہے کہیں کمتر ہے کہیں

حالات موافق گر ہوتے
تو اہل ہُنر بھی جی لیتے
ویرانے گلشن بن جاتے
دیوانے دامن سی لیتے

طوفان کی پیہم یورش نے
بڑھنے نہ دیا چلنے نہ دیا
ماحول کی تیرہ راتوں میں
مفلس کا دیا جلنے نہ دیا

انجام بہاراں کیا کہئے
اُمید کی کلیاں زرد ہوئیں
افسوس کہ آنسو خشک ہوئے
صد حیف کہ آہیں سرد ہوئیں

جینے کے لئے ہم جینے کے
اسباب مہیّا کر نہ سکے
ہر شے پہ مسلّط دولت تھی
ہم دولت پیدا کر نہ سکے

دولت کے شکنجے میں دن بھر
گھٹتا ہی رہا محنت کا گلا
ہاں رات کو فاقہ ٹوٹ گیا
جب خون پسینہ ایک ہوا

جو کرنا کیا۔ کہنا بھی نہ تھا
کہنا بھی پڑا۔ کرنا بھی پڑا
اربابِ وفا کو مجبوراً
جینے کے لئے مرنا بھی پڑا

مرنا ہے مقدر گھٹ گھٹ کر
ارمان سِسک کر کہتے ہیں
اُمید اشارا کرتی ہے
حالات بدلتے رہتے ہیں

طوفان کا دھارا تیز سہی
ہمّت نہ کنارہ کر جائے
مرنا ہو جسے جینے کے لئے
وہ جیتے جی کیوں مر جائے

دنیائے حوادث میں بڑھکر
جو وقت کا بندھن توڑے گا
وہ مردِ مجاہد ہی آخر
حالات کا دھارا موڑیگا

○

عزمِ جواں

دامنِ کہسار میں ہو لاکھ سامانِ کشش
سنگریزوں کی طرف کوہِ گراں جھکتا نہیں
موم ہو جاتا ہے سنگ آہن کو کھا جاتا ہے زنگ
آسماں ہوتا ہے خم عزمِ جواں جھکتا نہیں

○

دیکھ رہا ہوں

شاعر ہوں بچشمِ نگراں دیکھ رہا ہوں ۔۔۔ خلاقِ جہاں تیرا جہاں دیکھ رہا ہوں
اِک برقِ غضب میرے چمن پر ہے شرر بار ۔۔۔ اِک دیو بلا زہر فشاں دیکھ رہا ہوں
مدت سے مری انگلیاں ہیں نبضِ بشر پر ۔۔۔ رگ رگ میں تعصب ہے رواں دیکھ رہا ہوں
پستی ہیں جہاں ہڈیاں مزدور کی دن رات ۔۔۔ وہ کارگہہ برق و دخاں دیکھ رہا ہوں
اس شہرِ خموشاں میں بھی ہیں زیست کے آثار ۔۔۔ اُٹھتا ہوا مرگھٹ سے دھواں دیکھ رہا ہوں
پھر درپے آزار ہیں یوسف کے برادر ۔۔۔ پھر راہ میں حائل ہے کنواں دیکھ رہا ہوں
ہے میرے لئے بند درِ رحمتِ یزداں ۔۔۔ اور تنگ ہے آغوشِ بتاں دیکھ رہا ہوں
تکفیر کا فتویٰ ہے نہ تزویرِ سیاست ۔۔۔ مے خانے میں کچھ امن و اماں دیکھ رہا ہوں

میں اشک اسی کشورِ ظلمات نشاں سے
لوح و قلم و کون و مکاں دیکھ رہا ہوں!

تب دیکھ بہار کلکتہ

جناب اشک امرتسری نے درج ذیل نظم حلق کی تکلیف کے باوجود، رجنوری ۱۹۵۶ء کو بہت اصرار پر محمد علی لائبریری کے سالانہ مشاعرہ میں پڑھی۔ اشک صاحب کے متعلق یہ کہنا بے جا نہ ہوگا۔ کہ وہ ہم لوگوں کے زمانہ کے نظیر ہیں کلام کی سلاست، بیان کی بے ساختگی، اور جزئیات نگاری پہ قدرت کا اندازہ اس نظم سے کیا جا سکتا ہے۔

(ادارہ عصر جدید۔ کلکتہ)

جب دن کا جوبن ڈھلتا ہو، تب دیکھ بہار کلکتہ
اندھیارا روپ بدلتا ہو، تب دیکھ بہار کلکتہ
تخریب کا ایندھن جلتا ہو، تب دیکھ بہار کلکتہ
تعمیر کا لوہا گلتا ہو، تب دیکھ بہار کلکتہ
تہذیب کا چکر چلتا ہو، تب دیکھ بہار کلکتہ

۲

جب ظلم کا جھکڑ بہتا ہو جب موت کی آندھی چلتی ہو

جب ظالم کا گھر بنتا ہو، مظلوم کی کٹیا جلتی ہو
جب محنت کا دم گھٹتا ہو، اور دولت پھولتی پھلتی ہو
جب دھن کا دھوم دھڑکا ہو، اور فن کی لاش نکلتی ہو
اندھیارا نور نگلتا ہو، تب دیکھ بہار کلکتہ

۳

جب شہر کی گندی گلیوں میں ہر بچہ بوڑھا گریاں ہو
ماں دکھیا، باپ اپاہج، بیٹا بھوکا، بیٹی عریاں ہو
اور اونچے اونچے محلوں کا ہر کنکر پتھر خنداں ہو
اور حرص و ہوس کی محفل میں انگور کی بیٹی رقصاں ہو
بلوریں بادہ ڈھلتا ہو، تب دیکھ بہار کلکتہ

۴

جب شہر میں محنت سستی ہو، دیہات میں مہنگا غلّہ ہو
جب شہر خموشاں بستی ہو، مرگھٹ کا نام محلہ ہو
تقدیر ہنر پر ہنستی ہو، تقصیر کا بھاری پلّہ ہو
گاہک کو آنکھ ترستی ہو، فٹ پاتھ پہ پھرتا ہلّہ ہو
قانون کا ناگ اچھلتا ہو، تب دیکھ بہار کلکتہ

۵

مجنوں کا لقب جب پاتے ہوں، عشاق محبت کے بدلے
جب پیٹ کی آگ بجھاتی ہوں، لیلائیں عصمت کے بدلے
جب مکر کی بڑھیا رانی ہو، دوشیزۂ حکمت کے بدلے
مزدور کا پیٹ نہ بھرتا ہو، دن رات کی محنت کے بدلے
تن گھلتا ہو جی جلتا ہو، تب دیکھ بہار کلکتہ

۶

جب ظلم بڑھے مزدوروں پر مل والوں کا دلالوں کا
غل شور بڑھے تقریروں کا ہنگاموں کا ہڑتالوں کا
ہو ایکا ہندو مسلم کا اور میل ہو گوروں کالوں کا
جب فائر ہوں بندوقوں کے اور لشکر جھنڈے والوں کا
نعروں میں طوفان پلتا ہو۔ تب دیکھ بہار کلکتہ

۷

ہم دنیا ساری چھوڑ چکے یہ شہر نہ چھوٹا چھوٹے سے
اس شہر میں لاکھوں بھوکے ہیں اور دولت والے بھوڑے سے
یہ بھوڑے سے فرعون ہیں سارے جسم جہاں پر پھوڑے سے
یہ بھوڑے سے بو باس سے جن کی دل پر برسیں کوڑے سے

جب پھوڑا پیپ اگلتا ہو، تب دیکھ بہار کلکتہ

۸

جب گیسو بکھرے بکھرے ہوں، اور چہرہ زرد نگاروں کا
جب کلیاں روندی جاتی ہوں اڑتا ہو رنگ بہاروں کا
شہکار مٹائے جاتے ہوں، دل دکھتا ہو فن کاروں کا
اے اشک کسی کو کیا کہیے جب یار رہی اپنے یاروں کا
سینہ پر کودوں دلتا ہو، تب دیکھ بہار کلکتہ

○

بُلبلِ اُردو کی فریاد

اسلامیہ کالج کلکتہ کے مشاعرہ میں
۱۹۵۲ء میں پڑھی گئی

۱

قفس میں ہوں نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ صبا مجھکو
نہ یادِ آشیاں ہے اب نہ گلشن کا پتا مجھکو
مری قسمت نے رکھا ہمصفیروں سے جدا مجھکو
نہ راس آئی بہارِ باغ کی رنگیں فضا مجھکو
مسلسل حادثوں نے کر دیا آتش نوا مجھکو

۲

کہوں میں کچھ نہ گر بارِ سماعت ہو فغاں میری
اگر تابِ شنیدن ہو تو سنئے داستاں میری
یہ مانا مشتِ پر ہوں پر طبیعت ہے رواں میری
یقیں ہے مجھکو جائے گی نہ محنت رائیگاں میری
بہر صورت بیاں کرنا ہے اپنا مدعا مجھکو

۳

کبھی میں بُلبُلِ بُستانِ اُردو موجدِ فن تھا
کبھی میں طائرِ رنگیں نوا تھا جانِ گلشن تھا
کبھی میں روحِ صہبا، حُسنِ ساقی، گل کا جوبن تھا
چمن میں سب سے اونچی شاخ پر میرا نشیمن تھا
زمینِ شعر بھی ہم پایۂ عرشِ عُلےٰ مجھکو

۴

کبھی دنیا میں شہرہ تھا مری شیریں زبانی کا
مری آتش نوائی کا۔ مری رنگیں بیانی کا
فصاحت کا بلاغت کا سلاست کا روانی کا
میں اب بھی معدنِ حکمت، سمندر ہوں معانی کا
میسّر آج بھی ہے دولت فہم و ذکا مجھکو

۵

مرے خوان ادب میں سینکڑوں میوے ہزاروں پھل
تخیّل میں شفق ایران کی اور ہند کے بادل
کہیں تحریر سُرمہ اور کہیں بہتا ہوا کاجل
مری تعمیر میں خاکِ مقدس اور گنگا جل

سر آنکھوں پہ بٹھاتی تھی یہی اندر سبھا مجھکو

مرے نالوں میں شعلے بھی شرارے بھی ہیں طوفاں بھی
مرے نغموں میں عشرت بھی مسرت بھی ہے خوشیاں بھی
محبت بھی عقیدت بھی تصوّف بھی ہے عرفاں بھی
مرے حلقہ بگوشوں میں ہیں ہندو بھی مسلماں بھی
نہیں سمجھا گیا قبلہ - مگر قبلہ نما مجھکو

۷

بھگت تُلسی کی رامائن میں ملتا ہے پتا میرا
گرو نانک کے دوہوں میں مسلسل سلسلہ میرا
کبیرا اور اُس کی بانی میں بھی ہے حصّہ بڑا میرا
جو ڈھونڈو گے تو پاؤ گے نشاں تم جا بجا میرا
کہو کیسے مٹا دے گا یہ دورِ فتنہ زا مجھکو

۸

مرے دامن کی وسعت میں زبانیں ہیں زمانے کی
کہیں عربی، کہیں ترکی، کہیں بھاشا، کہیں ہندی
کہیں ہے فارسی اور پرتگیزی اور دیو بانی
کسی نے آج تک عاید نہیں کی مجھ پہ پابندی

انہیں سب راینوں نے مل کے راجا کر دیا مجھکو

۹

لگایا مجھکو سینے سے مِتل، سرشار و کیفی نے
پریم و کرشن و چکبست و کپور و عرش و بیدی نے
فراق و ساحر و آزاد و جوشِ ملسیانی نے
غرض یہ ہے جگہ دی دل میں ہر عظمت کے بھیدی نے
بدیشی کہہ کے لیکن سرپھروں نے دکھ دیا مجھکو

۱۰

مگر اس بے لبسی میں بھی دلوں پہ حکمراں ہوں میں
تمہاری روح کی گہرائیوں کا راز داں ہوں میں
یہ دنیا جانتی ہے بلبلِ ہندوستاں ہوں میں
بھلا بیٹھے ہو تم لیکن تمہارا ترجماں ہوں میں
تمہارے ہی اب و جد نے دیا یہ مرتبہ مجھکو

۱۱

کبھی تھی یہ زمیں میری فلک میرا وطن میرا
کبھی دنیا میں لوہا مانتے تھے اہل فن میرا
ادب سے نام لیتے تھے کبھی اہل چمن میرا

مگر اب منہ چڑاتے ہیں یہاں زاغ و زغن میرا
کہیں بھی سر چھپانے کو نہیں ملتی ہے جا مجھکو

۱۲

مجھی کو آج نامحرم سمجھتے ہیں یہ دیوانے
غضب ہے شمع محفل سے الجھ بیٹھے ہیں پروانے
قیامت یہ نہیں تو کیا اپنے بھی ہیں بیگانے
تعصّب ہے یہ اُن کا یا مری قسمت خدا جانے
"سمجھ ہی میں نہیں آتا مری کیا ہو گیا مجھکو"

مشاعرہ

اشکؔ یہ بزمِ ادب ہے یا تماشا گاہ ہے
ہر زباں پر واہ وا ہے واہ وا ہے واہ ہے

بس اسی میں مستتر ہے زندگی کا وہ نظام
زندہ قوموں کو دیا ہے جس نے مرنے کا پیام

پرورش پاتی ہے خود بینی خود رائی یہاں
اس جگہ دنیا سمجھتی ہے زمیں کو آسماں

اس جگہ ذروں کو تاروں سے ملایا جاتا ہے
اس جگہ خورشید پھونکوں سے بجھایا جاتا ہے

اس جگہ افلاس کو رنگیں بنایا جاتا ہے
قعرِ پستی کو ثریا کر دکھایا جاتا ہے

اس جگہ افسانۂ گل ہے جہانِ شاعری
قیس نے گویا سجائی ہے دکانِ شاعری

اس جگہ سب آتے ہیں سننے سنانے کیلئے
داد دینے کے لئے اور داد پانے کے لئے

جمع ہیں کچھ بھوکے پیاسے داد کے، تعریف کے
چند چربے لائے ہیں اسلاف کی تصنیف کے

ہر طرف ہے اک غرور، خودسری چھایا ہوا
ہر کوئی اپنی فضیلت پر ہے اترایا ہوا

ہر کسی کو اپنے اندازِ بیاں پر ناز ہے
لحن پر، الفاظ پر، لطفِ زباں پر ناز ہے

دیکھنا کیا پڑھ رہا ہے شاعرِ شیریں زباں
جس کی رگ رگ میں ہے شعر و شاعری کا خوں رواں

شعر ہی جس کی سحر ہے شعر ہی جس کی ہے شام
جس کو ہے فعلن فعولن فاعلاتن ہی سے کام

ہر کسی کو وصل و فرقت کا سماں مرغوب ہے
ہر زباں پر "مرحبا" "صد مرحبا" "کیا خوب" ہے

"دل ہی دل میں خونِ ارمانِ دلِ مضطر ہوا"
واہ یہ مصرعہ امیرؔ و داغؔ سے بہتر ہوا

پھر تو کہئے پھر سے کہئے اور کہتے جایئے!

جھوم کر تعریف کے دھاروں میں بہتے جایئے

اس جگہ لیتا نہیں ہے کوئی آزادی کا نام
اس جگہ ہے مطمئن اپنی غلامی پر غلام

اس جگہ متروک ہے افسانۂ دار و رسن
اس جگہ ممنوع ہے حُبِّ وطن ذکرِ وطن

اس جگہ اظہارِ دردِ قوم کر سکتے نہیں
ٹھوکریں کھا کھا کے جی سکتے ہیں مر سکتے نہیں

ہاں مگر کچھ اور ہے میری نظر میں شاعری
برقِ رقصاں ہے جہانِ خیر و شر میں شاعری

شاعری دار العمل میں صورِ اسرافیل ہے
شاعری بزمِ ادب میں شہ پرِ جبریل ہے

شاعری پیغامِ فطرت شاعری درسِ عمل
شاعری آئینۂ جذباتِ اقوام و ملل

اُردو سبھا کلکتہ

۸ ر اکتوبر ۱۹۵۰ء کو اُردو سبھا کلکتہ کا جلسہ زیر صدارت حضرت جوہر محمد آبادی منعقد ہوا جس میں مقامی شعرا اور ممبروں کے علاوہ جناب اثر مجیدی بھی شریک ہوئے۔ جناب اشک امرتسری نے سنٹرل کلکتہ کالج کے مشاعرہ کے متفرق اشعار پر تضمین پڑھی۔آج جناب اشک امرتسری کی تضمین درج کی جا رہی ہے۔

ابراہیم ہوشؔ - (عصرِ جدید کلکتہ)

حضرت وحشتؔ

غلط کہ نالۂ عشاق ہے بیانِ فراق
دراصل ایک حقیقت ہے داستانِ فراق
الگ ہے سایۂ افلاک سے جہانِ فراق
غمِ جہاں سے ہیں فارغ ستم کشانِ فراق
ترے ستائے ہوؤں کو فلک ستا نہ سکا

•

حضرت جرم محمد آبادی

یہ میرا ذوق سخن میرے کام آ نہ سکا
یہ میرا نغمہ رنگیں بھی گل کھلا نہ سکا
ہجوم شوق بھی منزل قریب لا نہ سکا
جنوں عشق کوئی معجزہ دکھا نہ سکا
جگر کے چاک سے دامانِ دل ملا نہ سکا

مہیب موجۂ منزل ہے دور ہے ساحل
ہوائے تند مخالف ہے تیغۂ قاتل
تلاش و کوشش و سعی و عمل ہے لاحاصل
ڈبو ہی دے اسے اے ناخدائے کشتیٔ دل
سفینہ میرا کنارے اگر لگا نہ سکا

جناب ناوک

بدل گیا ہے زمانہ فضا ہوئی مسموم
خموش ہو گئی بلبل بہار ہے مغموم
وفور درد و الم ہے مسرتیں معدوم
چمن میں دیکھ کے ہر سو تباہیوں کا ہجوم
کوئی غریب کہیں آشیاں بنا نہ سکا

جناب آصف

جو محوِ خواب رہا ایک باغ رعنا میں
جو پھول جھڑ نہ سکا دامنِ تمنا میں
الجھ کے رہ گیا جو بھی فریبِ لیلا میں
اُبھر سکا نہ کبھی وہ عمل کی دُنیا میں
نقوش دل سے امیدوں کے جو مٹا نہ سکا

جناب ہوش

نہیں کہ راز نہیں ہے حقیقتِ انساں
نہیں غرور کا باعث فضیلتِ انساں
خلافِ فطرتِ انساں ہے نخوتِ انساں
عبودیت کی قسم ہے یہ فطرتِ انسان
جبیں سے داغِ پرستش اگر مٹا نہ سکا

پروفیسر بیخود

خیال کیجئے کیوں میری ناتوانی کا
کہ معترف ہے جہاں میری سخت جانی کا
اگرچہ کُشتہ ہوں آفاتِ آسمانی کا
گماں رہا جو مجھے اُن کی بدگمانی کا
شکایتِ غمِ دوراں بھی لب پہ لا نہ سکا

پروفیسر نیازؔ

کیا ہے خلق نے دنیا کو جھوٹ سے راضی
ہوا و حرص کے عالم میں سچ ہے بے معنی
کہ ناگوار سی ہیں تلخیاں حقیقت کی

رہا میں حق کی حمایت میں صاف گو پھر بھی
جہاں کو زورِ صداقت کبھی دکھا نہ سکا

جناب واصفؔ

مقابلہ ہے مصائب کا لازمی واصفؔ
شکست فاش ہے صورت گریز کی واصفؔ
یہی ہے ایک حقیقت جچی تلی واصفؔ

ہے جد و جہد میں دراصل زندگی واصفؔ
میں بیچ کے موجوں سے ساحل کی سمت جا نہ سکا

جناب رضاؔ مظہری

اگرچہ قطرۂ خوں بھی نہیں رہا دل میں
مگر وہ درد ہے باقی ابھی جو تھا دل میں
نہ پوچھ مجھ سے مرے ہمنوا ہے کیا دل میں

تمام عمر کھٹکتا رہا رضاؔ دل میں
وہ ایک حرف تمنا جو لب پہ آ نہ سکا

گلشن شعر و سخن

بادۂ شعر و سخن رہتا ہے بے کیف و سرور
دیدۂ تر سے اگر خونِ جگر ڈھلتا نہیں
سچ تو یہ ہے اشک بے خون جگر بے دردِ دل
گلشن شعر و سخن ہی پھولتا پھلتا نہیں

اسلامیہ کالج کلکتہ کا مشاعرہ

جنابِ جُرمؔ (صدر جلسہ)

جنون عشق کوئی معجزہ دکھا نہ سکا
جگر کے چاک سے دامان دل ملا نہ سکا
ڈبو ہی دے اُسے اے ناخدائے کشتیٔ دل
سفینہ میرا کنارے اگر لگا نہ سکا

حضرتِ وحشتؔ

غمِ جہاں سے ہیں فارغ ستم کشانِ فراق
ترے ستائے ہوؤں کو فلک ستا نہ سکا

جنابِ آصفؔ

اُبھر سکا نہ کبھی وہ عمل کی دنیا میں
نقوشِ دل سے امیدوں کے جو مٹا نہ سکا

جنابِ ناوکؔ

چمن میں دیکھ کے ہر سُو تباہیوں کا ہجوم
کوئی غریب کہیں آشیاں بنا نہ سکا

پروفیسر بیخود

گماں رہا جو مجھے اُن کی بدگمانی کا
شکایت غم دوراں بھی لب پہ لا نہ سکا

پروفیسر نیاز

رہا میں حق کی حمایت میں صاف گو پھر بھی
جہاں کو زور صداقت کبھی دکھا نہ سکا

جناب واصف

ہے جد و جہد میں دراصل زندگی واصفؔ
میں بچ کے موجوں سے ساحل کی سمت جا نہ سکا

جناب رضا مظہری

تمام عمر کھٹکتا رہا رضاؔ دل میں
وہ ایک حرف تمنا جو لب پہ لا نہ سکا

جناب ہوش (سکریٹری)

عبودیت کی قسم ہے یہ فطرت انساں
جبیں سے داغ پرستش اگر مٹا نہ سکا

تعصّب ہے جواں اب بھی

قیامت ہے زمین ہند ہے شعلہ فشاں اب بھی
لرز اٹھتا ہے آہ بے کساں سے آسماں اب بھی
ہماری جستجو میں ہیں فلک کی بجلیاں اب بھی
کھٹکتا ہے نگاہوں میں ہمارا آشیاں اب بھی
ازل سے ہم ہیں مصروف گل آرائی چمن بندی
ہمارا خون ہے اِن بیل بوٹوں میں رواں اب بھی
ہمیں سے رونق کاشانۂ مہر و محبت ہے
ہمارے دم قدم سے ہے بہار بوستاں اب بھی
ہمیں پہ آج تہمت لگ رہی ہے بے وفائی کی
ہمیں سے بدگماں ہیں پاسباں اور باغباں اب بھی
جراثیم غلامی سے مکدر ہے فضا اب تک
ہوائے بغض و نفرت ہے تعصب سے جواں اب بھی
اہنسا کا پیمبر قبر میں ہے بیقرار اب تک
جہنم ہو رہا ہے کشور جنت نشاں اب بھی
یقیں ہے اب بھی گر اے اشک یاران وطن چاہیں
اٹھیں اور بند کردیں ظلم واستبداد کی راہیں

پیامِ حیات

ہم اپنی تیرہ شبی کی نہ صبح کر پائے
مگر جہاں میں پیام حیات نو لائے

بلا سے حال ہمارا اگر پریشاں ہے
تمہارے کاکل پیچاں تو ہم نے سلجھائے

کہیں کہیں غم دوراں میں ہے غم جاناں
کہیں کہیں ہیں کڑی دھوپ میں گھنے سائے

کمال دور خزاں ہے پیام دور بہار
سمجھ کے بھی نہ جو نہ سمجھو تو کون سمجھائے

نظام نو ہو کہ نظم کہن مگر ساقی
گدائے میکدہ میخانہ سے کہاں جائے

وہیں جنوں نے بکھیری ہے روشنی اپنی
چراغ عقل و خرد کے جہاں نہ کام آئے

یہ مکتب غم دل ہی ہے مکتب عرفاں
یہاں تو اشک مسلّم ہے آپ کی رائے

○

کبھی کبھی

یہ ناؤ بھی لگی ہے کنارے کبھی کبھی
ٹوٹے ہیں موجِ غم کے سہارے کبھی کبھی

ساقی تری نگاہِ کرم کی قسم مجھے
تاروں نے بھی کیے ہیں اشارے کبھی کبھی

اے آسماں ہم اہلِ زمیں نے زمیں سے بھی
پیدا کیے ہیں چاند ستارے کبھی کبھی

گذرے فرازِ دار پہ بھی زندگی کے دن
تیغوں کے سائے میں بھی گذارے کبھی کبھی

اے اہلِ ہوش ہم یہاں بے ہوش رہ کے بھی
جیتے ہیں بار بار تو ہارے کبھی کبھی

یوں بھی ہوا کہ جنسِ ہنر کے اٹھے نہ دام
جینا پڑا خدا کے سہارے کبھی کبھی

اہلِ جنوں نے پھینک کر اپنی کلاہ کج
شاہوں کے سر سے تاج اتارے کبھی کبھی

اب گنگنا رہے ہیں تو گائیں گے ایک دن
سنتے تو ہیں وہ گیت ہمارے کبھی کبھی

یوں بھی ہوا ہے اشک کہ کو بن گئی ہے لے
نے سے بھڑک اٹھے ہیں شرارے کبھی کبھی

غزل

یہ کشتیٔ حیات، یہ طوفانِ حادثات
مجھ کو تو کچھ خبر نہ رہی آر پار کی

ہے گردشِ زمانہ میں دو رنگیٔ حیات
امید کی سحر ہے تو شب انتظار کی

یہ دیر، یہ حرم، یہ کلیسا، یہ سومنات
تعریف کیا ہو قدرتِ پروردگار کی

ہے کون جو اُٹھا سکے بارِ غمِ حیات
ہم نے بھی تو قبائے خرد تار تار کی

اللہ رے تصادمِ حالات و حادثات
کی اختیارِ سنگ نے صورت شرار کی

ذروں کی آب و تاب سے تاروں نے کھائی مات
یہ خوبیاں ہیں خاک ترے انکسار کی!

اے اشک زندگی میں نہ پوچھی کسی نے بات
اب خاک چومتے ہیں ہمارے مزار کی

غزل

قیدِ ہستی میں ہوں اپنے فرض کی تعمیل تک
اک نئی دنیا، نئے انسان کی تشکیل تک

دام ہم رنگِ زمیں پھیلا دیا صیّاد نے
وادیٔ گنگ و جمن سے رود بارِ نیل تک

آنکھ سے بہہ جائے گا دل میں اگر باقی رہا
قطرۂ خوں داستانِ درد کی تکمیل تک

شاعری کا ساز ہے وہ ساز ہے جس ساز میں
نغمۂ روح الامیں سے بانگِ اسرافیل تک

تو ہی اسرارِ سخن سے ہے ابھی نا آشنا
ورنہ اس اجمال میں موجود ہے تفصیل تک

بس نہیں چلتا ہے ان کا، ورنہ یہ ظلمت پرست
اپنی پھونکوں سے بجھا دیں عرش کی قندیل تک

اشکؔ! اپنے سینۂ پرخوں میں سیلِ اشک بھی
روک رکھتا ہوں جگر کے خون کی تحلیل تک

غزل

کشمکش میں ہیں تری زلفوں کے زندانی ہنوز
شام غم ہے اور خم در خم پریشانی ہنوز

رکھتے ہیں ہم مقصدِ تعمیرِ نو پیشِ نظر
گرچہ ہیں منجملۂ اسبابِ ویرانی ہنوز

سطحِ دریا پر سکوں سا ہے مگر اے سطح بیں
قعرِ دریا میں یہی موجیں ہیں طوفانی ہنوز

اب جنوں میں بھی نہیں آتا ہے صحرا کا خیال
گلستانِ فہم و دانش میں ہے ویرانی ہنوز

پرسشِ اہلِ قلم ہو یا نہ ہو۔ ہوتی تو ہے
سنگ مرمر کے مزاروں پر گل افشانی ہنوز

ہم نے رکھ دی قالبِ اشعار میں چیزے دگر
تم نہیں کر پائے تکمیلِ زباں دانی ہنوز

ہم اصولِ کسبِ زر سے تو نہیں ہیں آشنا
تشنۂ تکمیل ہے تیری ہمہ دانی ہنوز

غزل

مطلب دل لبِ اظہار تک آپہنچا ہے
سلسلہ بات کا تلوار تک آپہنچا ہے

نغمۂ نَو نہ رہا سازِ طرب میں محبوس
طوق و زنجیر کی جھنکار تک آپہنچا ہے

اب زباں وقف ہے اظہارِ حقیقت کیلئے
اب قلم مذہب تلوار تک آپہنچا ہے

دیکھ زریں کلس چرخ مقرنس کو نہ دیکھ
سیل طوفاں در و دیوار تک آپہنچا ہے

مست صہبائے مساوات کا دست گستاخ
شیخ کے طرۂ دستار تک آپہنچا ہے

ہمنوا صحن گلستاں میں نہ کر اُس کو تلاش
اشک شہر رسن و دار تک آپہنچا ہے

غزل

عشق میں بھی اِس قدر رنگینیاں رکھتا ہوں میں
خونچکاں سینہ اور آنکھیں خوں فشاں رکھتا ہوں میں

زندگی میری بذاتِ خود ہے طوفانِ عظیم
سینکڑوں طوفاں تہِ دامن نہاں رکھتا ہوں میں

ضبط کا خوگر ہوں اور پابند آئینِ وفا
ورنہ دل میں محشرستانِ فغاں رکھتا ہوں میں

شمع ساں جلتا تو ہوں پر شمع ساں بجھتا نہیں
عشق کا سینے میں سوزِ جاوداں رکھتا ہوں میں

تاکہ دنیا جل اٹھے شعر و سخن کے سوز سے
"غالب" اشعار میں چنگاریاں رکھتا ہوں میں

چند قطرے بہہ گئے ہیں دیدۂ تر سے تو کیا
اشک ان آنکھوں میں بحرِ بیکراں رکھتا ہوں میں

ظلومُ اجھولاً

(اسحاق امرتسری)

بڑا نام اُس کا تھا اہلِ وطن میں
اُسے لوگ کہتے تھے ظالم ستم گر
ولیکن ستم گر ہے وہ اب نہ ظالم
کہ سب اُس کے ظلم و ستم کے فسانے
ہیں اگلے زمانے کے قصّے پرانے

یہ سچ ہے فسادات کے جمگھٹوں میں
مسلمان ہوتے جہاں پر صف آرا
مقابل ہیں اہل وطن دشمنوں کے
نکلتا تھا وہ لے کے خونریز خنجر
کہ چاٹا تھا جس نے لہو بے محابا
کبھی سرکشوں کا کبھی بے لبسوں کا
مگر اب وہ خنجر بھی ہے زنگ خوردہ
طبیعت بھی اس کی ہے مُردہ فسردہ

وطن سے بہت دور بنگال میں اب
وہ تاجر کے بہروپ میں رونما ہے
عجب شان ہے اُس کے گھر کی محل کی
عجب اُس کے دفتر میں دھن کی کھناکھن
ملے ہیں اُسے جنگ جاپاں کے "پرمٹ"
ولایت کے گوروں کے جھرمٹ میں ہے وہ
شراب اُس کی دکّان پہ بک رہی ہے
حسینوں کے جھُرمٹ میں اس کے جلو میں
معزز مکرم ہے - ظالم ستم گر

وہ جب رہ گزر پر پڑی دیکھتا ہے
ستم کش غریبوں کی لاشیں برہنہ
تو حیرت سے کہتا ہے پروردگارا
یہ کیسی بلا ہے کہ مخلوق تیری
سرِ راہ یوں اِس طرح مر رہی ہے
کوئی ان کے لاشے اٹھاتا نہیں کیوں
کوئی اِن پہ آنسو بہاتا نہیں کیوں

یہ کہتے تھے اک دن کلکٹر بہادر
کہ یہ جنگ جاپاں ہی کے ہیں شگوفے
مگر بات اُن کی ہے یہ صاف جھوٹی
کہاں سرفروشوں کی خونیں نعشیں
کہاں اِن بچاروں کے مفلوج لاشے
یہ جنگی جوانوں کے لاشے نہیں ہیں

کوئی کہہ رہا تھا یہ بھوکے مرے ہیں
کہ اس ملک میں قحط ہے چاولوں کا
قسم ہے علی ولی شاہِ دیں کی
یہ ممکن نہیں وہ خداوندِ عالم
جو بندوں کو ہے رزق دینے کا ضامن
وہ آپ اپنے بندوں کو یوں مار ڈالے
قیامت سے پہلے قیامت ہو برپا

گرانی کی ابتک خبر تھی نہ اُس کو
ترقی یہ تھا کاروبیوپار اُس کا

میسّر اُسے نعمتیں تھیں ملذّذ
کہ خوش اُس کو رکھتے تھے گورے گورنر
پیئے جام گلرنگِ صہبائے احمر
وہ کیا جانے کس دام پر بک رہا ہے
دیہاتوں کے بازار میں دھان چاول

اک عورت سرِ راہ سر پیٹتی ہے
قریب اُس کے اک لاش اوندھی پڑی ہے
وہ چلا رہی ہے خدا را۔ خدا را
یہ پھر جی اٹھے گا۔ یہ مُردہ نہیں ہے
یہ دو دن کا بھوکا ہے اللہ والو
کوئی اُس کو کھانا کھلا دے خدا را

سنی اُس نے فریاد و زاری جو اُس کی
ہوا اُس کے دل پر عجب خوف طاری
لگا کانپنے بے طرح وہ ستم گر
یہ پہلا تھا موقع کہ وہ زندگی میں

ڈرا اور ڈرا بھی تو خوف خدا سے

چلا مول لینے وہ چاول کے بستے
کہ لنگر وہاں کھول دے عام جس میں
ملے مفت سب کو شب و روز چاول
کہ ہو دور یہ سب ہلاکت مصیبت
جو چاروں طرف سر پہ منڈلا رہی ہے
مگر اُس نے بازار بھر میں کہیں بھی
نہ چاول کی دکّان پائی نہ چاول
کہ اُس ملک میں قحط تھا چاولوں کا

دھرے صبر کی سل کلیجے پہ اپنے
وہ دکان پر اپنی خاموش بیٹھا
کسی سوچ میں دیر سے منہمک ہے
اُداسی ٹپکتی ہے چہرے سے اُس کے
مشوّش ہے وہ تُند خو دیو قامت

خریدار اک باوقار آن پہنچا
برانڈی کی کچھ بوتلیں مول لینے
کہا اِس نے اُس سے اماں یار بابو
مجھے چاولوں کی ضرورت ہے لیکن
سنا ہے کہ یاں قحط ہے چاولوں کا
بہت زور سے وہ ہنسا اور یہ بولا
تھی یہ بھی کوئی بات، آؤ مرے ساتھ
تمہیں دھان چاول ڈُلا دوں اسی دم
ذخیرے مرے پاس ہیں چاولوں کے

گدام اُس خریدار کے اس نے دیکھے
جو دریا کے ساحل پہ پھیلے ہوئے تھے
مقفل جہاں رزق تھا بے لبسوں کا

کہا اس نے، بابو یہ بورے ہیں کس کے
کہا اس نے یہ مال میرا ہے میرا
کہا اس نے اور لوگ بن چاولوں کے

ہزاروں ہزاروں مرے جا رہے ہیں
وہ بولا کہ صاحب یہ سچ ہے بجا ہے
مگر ہم تو لاکھوں ہزاروں کے توڑے
شب و روز پیدا کئے جا رہے ہیں

گلا اس نے بابو کا پکڑا لپک کر
کہا قتل تیرا ہے از بس ضروری
مقفل کیا رزق لوگوں کا تو نے
تو جب تک جیئے گا بلا قحط کی بھی
خدا کی قسم ہے کہ باقی رہے گی

یہ کہتے ہوئے اُس نے خونریز خنجر
کمر سے نکالا کیا قتل اُس کو
کہ جا اور لاکھوں ہزاروں کے توڑے
مزے سے شب و روز پیدا کئے جا

بہت خون اُس نے کئے تھے ولیکن

یہی آخری خون تھا خونِ ناحق
ہوا جس کا شہرہ زمیں سے فلک تک
کہ یہ خون تھا خونِ گلرنگ و مے گوں
تقدس میں گنگا روانی میں جیحوں
چھپائے سے چھپتا تو چھپتا یہ کیونکر

فرشتے تحیر میں عرش بریں سے
اتر آئے ہیں فرش پر دیکھنے کو
کہ اک ابنِ آدم ظَلُوْمًا جَھُوْلًا
جسے خلق کہتی تھی ظالم ستمگر
وہ پھانسی کے تختے سے خلدِ بریں کو
بہ رفتارِ رفرف اڑا جا رہا ہے

ستاروں کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہیں
مشیئت کے ہونٹوں پہ ہے مسکراہٹ

جبریلؑ و ابلیس

(علامہ اقبال کی نظم پر تضمین۔ از اسحاق امرتسری)

جبریلؑ:۔ اے رفیق خانہ ویراں کس طرف جاتا ہے تو
کیا سمائی ہے ترے سر میں ہے کس کی جستجو
خیر سے کیا حال ہے تیرا انگار شعلہ رو
ہمدم دیرینہ کیسا ہے جہانِ رنگ و بُو؟
"سوز و ساز و درد و داغ و جستجو و آرزو"

جبریلؑ:۔ ذکر رہتا ہے ترا اس بارگہ میں کو بکو
یاد آتے ہیں ہمیں تیرے مقاماتِ علو
کیا سبب اپنے رفیقوں کو بھلا بیٹھا ہے تو
ہر گھڑی افلاک پر رہتی ہے تیری گفتگو
کیا نہیں ممکن کہ تیرا چاکِ دامن ہو رفو

ابلیس:۔ آہ تو آگہ نہیں سینہ کے سوز و ساز سے
تلخیٔ مے سے جمالِ جلوۂ طنّاز سے
شعلۂ دل کی لپک سے آہ کی پرواز سے
آہ اے جبریلؑ تو واقف نہیں اس راز سے

کر گیا سرمست مجھ کو ٹوٹ کر میرا سبو

ابلیس:۔ کیسے آسکتا ہوں میں اس بارگہ میں ہم نشیں
یہ خموشی قبر کی یہ منظر اندوہ گیں
دام میں خود سے پھنسا ہے طائر زیرک کہیں
اب یہاں میرا گذر ممکن نہیں ممکن نہیں
کس قدر بے کیف ہے یہ عالم بے کاخ و کو
جس کی محرومی سے وابستہ ہوں اسرار حیات
جس کی مایوسی سے روشن ہوں چراغ ممکنات
جس کے نالے توڑ دیں سکان گردوں کا ثبات
جس کی نومیدی سے ہو سوز درون کائنات
اُس کے حق میں تقنطوا اچھا ہے یا لاتقنطوا

جبریلؑ:۔ اے مرے مشفق مرے ہمدم نگار ہوشمند
مدتوں چشم ملائک میں رہا تو ارجمند
تیرے کلمے دل کشا تھے تیری باتیں دلپسند
کھو دیئے انکار سے تو نے مقامات بلند
چشم یزداں میں فرشتوں کی رہی کیا آبرو

ابلیس:۔ میرے اس انکار سے باقی ہے میری آبرو

شور اس انکار کا کونین میں ہے چار سو
یاد رکھ اس بات کو اے ذاکرِ اللہ ہو
ہے مری جرأت سے مشتِ خاک میں ذوقِ نمو
میرے فتنے جامۂ عقل و خرد کا تار و پو

آ ذرا ہمراہ میرے قعرِ دریا میں اُتر
بحر کے سینے کے اندر دیکھ طوفانِ شرر
تو ہے اسرارِ حقیقت سے سراسر بے خبر
دیکھتا ہے تو فقط ساحل سے رزمِ خیر و شر

کون طوفاں کے تمانچے کھا رہا ہے میں کہ تو
دیکھ مجھ کو کس طرح یہ مرتبہ حاصل ہُوا
مرحبا ہمت پہ اور جرأت پہ میری مرحبا
میرے ہاتھوں سے دو عالم میں قیامت ہے بپا
خضر بھی بے دست و پا الیاس بھی بے دست و پا
میرے طوفاں یم بہ یم دریا بہ دریا جُو بجُو

گرچہ کچھ مطلب نہیں تجھ کو کسی کی چاہ سے
دیکھ میری سمت اپنی چشمِ حق آگاہ سے
بات اک سُن بے زبانِ ہمدمِ گمراہ سے

گر کبھی خلوت میسّر ہو تو پوچھ اللہ سے
قصّۂ آدم کو رنگیں کر گیا کس کا لہو

تجھکو میں سمجھا چکا اے دوست بہتیری طرح
تو اُبھر سکتا نہ ہمدم ڈوب کر میری طرح
میں سمجھتا ہوں مآلِ خیر و شر اچھی طرح
میں کھٹکتا ہوں دلِ یزداں میں کانٹے کی طرح
تو فقط اللہ ہُو، اللہ ہُو۔ اللہ ہُو
میں بہ گردش سر بسودا پابجولاں کو بکو
تو بہ تسبیح و ثنائے بارک اللہ اسمہٗ
میں سراپا فتنہ یکسر فتنہ ساماں فتنہ جو
تو فقط اللہ ہُو۔ اللہ ہُو۔ اللہ ہُو
میرے فتنے جامۂ عقل و خرد کا تار و پُو

لینن خدا کے حضور میں

علامہ اقبال کی نظم پر تضمین

(اسحاق امرتسری)

اے خالقِ انواعِ عجوباتِ سمٰوات
اے فاطرِ اقسامِ طلسماتِ شہودات
اے محفلِ کونین میں روشن ترے لمعات
اے انفس و آفاق میں پیدا ترے آیات
حق یہ ہے کہ ہے زندہ و پائندہ تری ذات

چکرّ میں فلاطوں کی نگاہِ ہمہ بیں ہے
سُقراط بھی گم کردہ رہِ حق و یقیں ہے
یا رب تو تمدّن کی زمیں پر بھی کہیں ہے
میں کیسے سمجھتا کہ تو ہے یا کہ نہیں ہے
ہر دم متغیّر تھے خرد کے نظریات

ششدر رہے بشر دوستہ معتزلی سے

واقف وہ نہ اسرارِ خفی سے نہ جلی سے
افلاک سے انجم سے نہ گل سے نہ کلی سے
محرم نہیں فطرت کے سرودِ ازلی سے
بینائے کواکب ہو کہ دانائے نباتات

برحق سبقِ عیسیٰؑ مریم ہوا ثابت
دشمن جسے سمجھا تھا وہ ہمدم ہوا ثابت
جانا جسے حقیر، مکرم ہوا ثابت
اب آنکھ سے دیکھا تو وہ عالم ہوا ثابت
میں جس کو سمجھتا تھا کلیسا کے خرافات

گردن میں ہماری ہیں صعوبات کے پھندے
گمراہ دماغ اور خیالات ہیں گندے!
یارب تو ہمیں اور نہ اب رنج و محن دے
ہم بندِ شب و روز میں جکڑے ہوئے بندے
تو خالقِ اعصار و نگارندۂ آنات

اک مسئلہ ہے سخت جو فرصت ہو تو پوچھوں
پوچھوں تو سہی حسن طلاقت ہو تو پوچھوں
لیکن جو نہ وہ بارِ طبیعت ہو تو پوچھوں

اک بات اگر مجھکو اجازت ہو تو پوچھوں
حل کر نہ سکے جس کو حکیموں کے مقالات

جب تک کہ نہ میں دفن ہوا خاک کے نیچے
اندوہ و الم کے خس و خاشاک کے نیچے
دل تڑپا کیا سینۂ صد چاک کے نیچے

جب تک میں جیا خیمۂ افلاک کے نیچے
کانٹے کی طرح دل میں کھٹکتی رہی۔ یہ بات

یوں سیل نہ اشکوں کا مری آنکھوں سے بہتا
یوں جور حوادث کے نہ میں قلب پہ سہتا
دنیا میں اگر تجھ سے میں کہہ سکتا تو کہتا

گفتار کے اسلوب پہ قابو نہیں رہتا
جب روح کے اندر متلاطم ہوں خیالات

وہ کون بشر ہے جو فرشتوں کا ہے مسجود
وہ کون سی ہستی ہے جو ہے حامد و محمود
وہ کون ہے ہم جس کو کہیں مہدی موعود

وہ کونسا آدم ہے کہ تو جس کا ہے معبود
وہ آدم خاکی کہ جو ہے زیر سمٰوات

یہ سادہ و پُرکار حکیمانِ فرنگی
یہ فتنۂ بیدار جوانانِ فرنگی
دانا و خردمند بلیدانِ فرنگی
مشرق کے خداوند سپیدانِ فرنگی
مغرب کے خداوند درخشندہ فلزات

حکمت کے اک اک حرف پہ مغرب کی نظر ہے
افلاک سے تاتحت سریٰ اُس کا گذر ہے
سرتا بقدم فتنہ وہاں نوعِ بشر ہے
مغرب میں بہت روشنیٔ علم و ہنر ہے
حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات

بنکوں کے محل دیکھے جو مغرب کی فضا میں
ثانی نہ آئے اُن کا نظر ارض و سما میں
گرجوں سے ملائے جو انہیں حسن و ادا میں
رعنائیٔ تعمیر میں رونق میں صفا میں
گرجوں سے کہیں بڑھ کے ہیں بنکوں کے عمارات

مغرب کی زمیں گرچہ مجھے وادیٔ طُوی ہے
ڈوبا وہ جسے اُس کی تجارت نے چھوا ہے

ایسا بھی کسی دَور میں اندھیر ہُوا ہے
کہنے کو تجارت ہے حقیقت میں جُوا ہے
سُود ایک کا لاکھوں کے لئے مرگ مفاجات

سکتے میں ہے ابلیس بھی وہ علم کی شوکت
حکمت کا یہ عالم کہ فلاطون کو حیرت
دیکھے جو حکومت تو سکندر کو ہو خفّت
یہ علم یہ حکمت یہ تدبّر یہ حکومت
پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیم مساوات

مغرب کو اگر غور سے دیکھے کوئی حسّاس
لب پر ہو رواں اُس کے معاً سورہ والنّاس
انسان کی صورت میں نظر آئیں گے خنّاس
بیکاری و عریانی و مے خواری و افلاس
کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات

وہ قوم کہ جو زہرِ رعونت سے ہو مسموم
مذہب جہاں ناپید مروّت جہاں مذموم
اور درد کے جذبات ہوں جس قوم میں معدوم
جو قوم کہ فیضانِ سماوی سے ہو محروم

حد اس کے کمالات کی ہے برق و بخارات

کیا قہر ہے یورپ کے مکینوں کی حکومت
اجرام کے پوشیدہ دفینوں کی حکومت
اور ایتھر و ایٹم کے خزینوں کی حکومت
ہے دل کے لئے موت مشینوں کی حکومت
احساس مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

بدلی ہے ہوا ایسی کہ اب غرب کے شاطر
حیران و پریشان نظر آتے ہیں بظاہر
خود فسق سے اپنے ہی فنا ہوں گے یہ فاجر
آثار تو کچھ کچھ نظر آتے ہیں کہ آخر
تدبیر کو تقدیر کے شاطر نے کیا مات

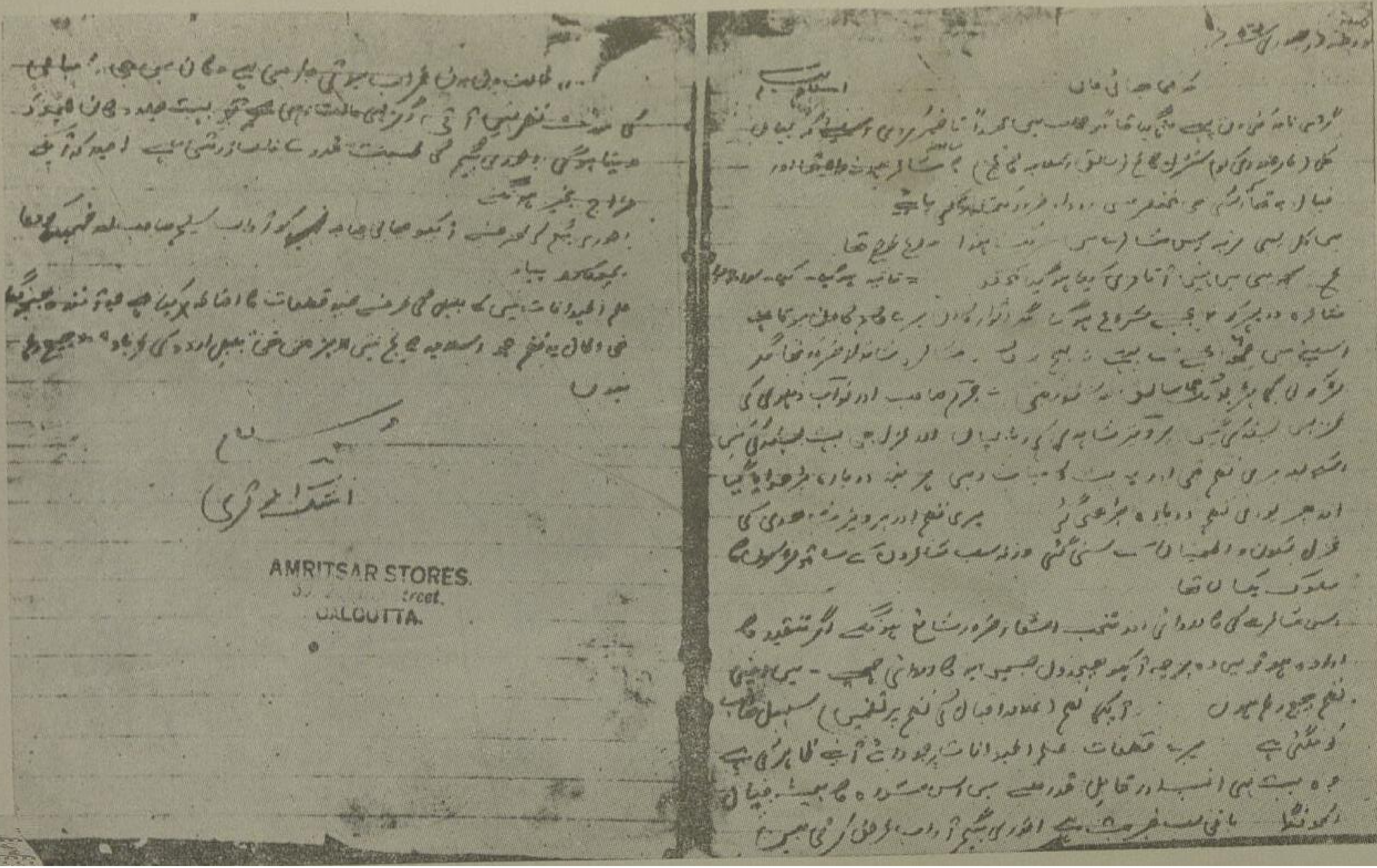
ہلنے لگے ہیں بام و درِ صبر و تحمل
میخانے میں برپا ہے عجب شور عجب غل
ڈر ہے کہیں اڑ جائے نہ شیشوں میں بھری مل
میخانے کی بنیادوں میں آیا ہے تزلزل
بیٹھے ہیں اسی فکر میں پیران خرابات

جلوے نظر آتے ہیں جو ہر روز لب بام

یہ مہوشیں گل پیرہن و گل رخ و گل فام
یہ عشوہ و یہ ناز حسینانِ گل اندام
چہروں پہ جو سرخی نظر آتی ہے سرِ شام
یا غازہ ہے یا ساغر و مینا کی کرامات

حرف آئے ترے عدل پہ اکنافِ زماں میں
یہ بات تو آ سکتی نہیں وہم و گماں میں
شُہرہ ہے عدالت کا تری کون و مکاں میں
تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں
ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات

ہے چور حوادث سے مرے دل کا نگینہ
کیا ظالم و فاجر ہے یہ دولت کی حسینہ
کیوں اس سے برئیت کا نہیں کوئی قرینہ
کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ
دنیا ہے تری منتظر روزِ مکافات



AMRITSAR STORES.
treet.
CALCUTTA.

مکتوب اشک مرحوم

مورخہ :- ۷ جنوری ۱۹۵۲ء

مکرمی بھائی جان : السلام علیکم

گرامی نامہ کئی دن پہلے مل گیا تھا۔ مگر جواب میں عمداً تاخیر کر دی۔ اس لئے کہ یہاں کل (۶ جنوری کو) سنٹرل کالج (سابقہ اسلامیہ کالج) کا سالانہ مشاعرہ ہونیوالا تھا۔ اور خیال تھا کہ اُس کی بھی مختصر سی روداد ضرور لکھنی چاہیئے۔

میں کل پہلی بار اس مشاعرہ میں شریک ہوا۔ مصرع طرح تھا۔

"سمجھ ہی میں نہیں آتا مری کیا ہوگیا مجھ کو"

قافیہ :- ہوگیا۔ گویا۔ سوا۔ دوسرا

مشاعرہ دوپہر کو دو بجے شروع ہوگیا۔ مگر اتوار کا دن مرے کام کا دن ہوتا ہے۔ اس لئے میں چھ بجے سے پہلے نہ پہنچ سکا۔ مشاعرہ شاندار ضرور تھا۔ مگر لڑکوں کی ہوٹنگ بھی سابق دستور تھی۔ جرم صاحب اور نواب صاحب دہلوی کی غزلیں پسند کی گئیں۔ پرویز صاحب کی رباعیاں اور غزل بھی بہت پسند کی گئی۔ اس کے بعد میری نظم تھی۔ اور یہ

بہت کامیاب رہی۔ ہر بند دوبارہ پڑھوایا گیا اور پھر پوری نظم دوبارہ پڑھی گئی۔ میری نظم اور پرویز شاہدی کی غزل سکون و اطمینان سے سنی گئی۔ ورنہ سب شاعروں کے ساتھ لڑکوں کا سلوک یکساں تھا۔

اس مشاعرے کی کارروائی اور منتخب اشعار ضرور شائع ہوں گے۔ اگر تنقید کا ارادہ ہو تو میں وہ پرچہ آپ کو بھیج دوں جس میں یہ کارروائی چھپے۔ میں اپنی نظم بھیج رہا ہوں۔ آپکی نظم (علامہ اقبال کی نظم پر تضمین) سہیل صاحب کو مل گئی ہے۔ میرے قطعات علم الحیوانات پر جو رائے آپ نے ظاہر کی ہے وہی انسب اور قابلِ قدر ہے۔ میں اس مشورہ کا ہمیشہ خیال رکھوں گا۔ باقی خیریت ہے۔ انوری بیگم آداب عرض کرتی ہے۔ کاروبار کی حالت دن بدن خراب ہوتی جارہی ہے۔ دکان میں بھی کامیابی کی صورت نظر نہیں آتی اگر یہی حالت رہی تو بہت جلد دکان چھوڑ دینا ہوگی۔ انوری بیگم کی طبیعت قدرے نادرست رہتی ہے۔ امید ہے کہ آپ کے مزاج بخیر ہوں گے۔ انوری بیگم کی طرف سے آپ کو بھابی صاحبہ کو آداب۔ سلیم صاحب اور فہمیدہ کو دعا۔ بچوں کو پیار۔

علم الحیوانات میں بلبل کی طرف سے چند قطعات کا اضافہ کیا ہے جو آئندہ بھیجونگا فی الحال یہ نظم جو اسلامیہ کالج میں پڑھی تھی بھیج رہا ہوں۔

والسلام۔ (اشک امرتسری)

"Ashk" Amritsari. c/o
14 ZAKARIA STREET Rashid & Co
CALCUTTA. 14 Zakaria St
Calcutta

[illegible]

Ref. No. السلام علیکم مکرمی بھائی جان Date 2 — 8 — [illegible]

بہت شرمندہ ہوں کہ بہت دنوں سے کوئی خط نہیں لکھ سکا
عزیزی [illegible] کا خط [illegible] بھی ملا تھا مگر [illegible]
جواب دینے کی نوبت ہی نہ پہنچ سکی [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] اور آخر سے خالی کر دیا

بہر حال [illegible] رہنا [illegible]
کر رہا ہوں پندرہ دن ہوتے کلکتہ کو چھوڑ دیا
ہے اور [illegible] دو ماہ تک باہر [illegible]
کلکتہ میں [illegible]
[illegible]
[illegible]
عزیزی [illegible] اور بچوں کی خیریت سے [illegible]
[illegible] بچوں کو [illegible]
[illegible]

[illegible]

مکتوب اشک مرحوم

مورخہ: ۲/ اگست ۱۹۶۴ء

مکرمی بھائی جان :- السلام علیکم

بہت شرمندہ ہوں کہ بہت دنوں سے کوئی خط نہیں لکھ سکا۔ عزیزی محمد سلیم کا خط اور عید کارڈ بھی مل گیا تھا۔ مگر مجھے جواب دینے کی نہ فرصت تھی نہ ہوش تھا۔ اب دکان ختم کر دینے کے بعد قدرے سکون ہوا ہے۔ یہ بلائے جان تھی جو گھُن کیطرح مجھے کھا گئی۔ تقریباً تین ہزار روپے الوری کے (جسکا مجھے علم ہی نہیں تھا) اس دکان کی نذر ہو گئے اور آخر اسے خالی کر دینا پڑا۔

بہر حال اب میں پھر سے اپنا کام یعنی دوا فروشی کر رہا ہوں۔ پندرہ دن ہوئے کلکتہ کو چھوڑ دیا ہے۔ اور ایک یا دو ماہ تک باہر ہی رہونگا۔ الوری کلکتہ میں ہے۔ اس خط کا جواب کلکتہ کے پتہ پر لکھیئے گا۔ مجھے مل جائیگا۔ معلوم نہیں اب آپکی صحت کیسی رہی ہے۔ اپنی اور بچوں کی خیریت سے ضرور مطلع فرمائیں۔ عزیزی محمد سلیم اور اُن کے بچوں کی خیر و عافیت بھی لکھیئے الوری کا تقاضا ہے کہ گروپ فوٹو اُس کو ضرور بھیجدینا چاہیئے۔ اور الوری کو

یہ بھی شکایت ہے کہ آپ نے اُس خط کا جواب نہیں لکھا جس میں میرے خلاف بہت سی شکائتیں اُس نے لکھی تھیں) یہ خط میں رائے رنگ پور سے لکھ رہا ہوں۔کل یہاں سے ٹاٹا نگر چلا جاؤنگا۔اپنی ایک غزل بھی بھیج رہا ہوں۔بھابی صاحبہ اور فہمیدہ کو سلام علیکم۔بچوں کو دعا اور پیار ۔

(اشک امرتسری)

اقتباسات

از

سیل اشک

تعارف اور تبصرہ

اشک امرتسری مرحوم کے نام سے کلکتہ کا اردو داں طبقہ اچھی طرح واقف ہے وہ صرف خواص ہی میں نہیں بلکہ یہاں کے عوام میں بھی مقبول ہو گئے تھے قبول عام کی یہ منزل ان کی زندگی کے آخری دور میں آئی۔ اشک صاحب اسحٰق امرتسری صاحب کے چھوٹے بھائی تھے۔ اسحٰق صاحب ایک صحافی اور نقاد کی حیثیت سے اپنا لوہا منوا چکے تھے۔ اشک صاحب کے ذوقِ ادب کے نکھار میں بڑے بھائی کی شفقت اور تربیت بھی ضرور شریک رہی ہوگی۔ اشک صاحب کی تحریروں ہی سے نہیں بلکہ گفتگو سے بھی صاف ظاہر ہوتا تھا کہ مرحوم نے علمی ماحول میں آنکھ کھولی تھی۔ اور اس علمی پسِ منظر نے ان کی ہر قدم پہ دستگیری کی تھی۔ ان کی زندگی بڑی مشقت اور جانفشانی کی زندگی تھی۔ کلکتہ اور اس کے مضافات میں جا جا کر دوائیں بیچتے اور گھر لوٹتے تو تھکن ہی نہیں بلکہ ایک نہ تھکنے والی مسکراہٹ بھی ساتھ لاتے۔ اس مجاہدانہ زندگی نے ان کو عوام کے پہلو ہی میں کھڑا نہیں کیا بلکہ محنت کش طبقے کے دل کا گہرائیوں میں اترنے کا موقع بھی دیا عوامی مسائل ان کے احساس و شعور کو متوجہ کرنے لگے

سنہ ۱۹۵۱ء سے پہلے تک اشک صاحب کی شاعری مذہبی اور نیم مذہبی موضوعات کے گرد گھومتی رہی تھی۔ ترقی پسند تحریک نے مرحوم کو دوسرے اہم مسائل کی طرف دعوت

توجہ دی۔ اشک صاحب اپنے سینے میں دردمند دل رکھتے تھے۔ ان کے جذبات میں خلوص تھا۔ ان کے شعور میں استقبالی صلاحیت موجود تھی۔ وہ بڑی بے باکی اور دردمندی کے ساتھ قدم بڑھاتے ہوئے "سرفروشوں کے کارواں" میں شریک ہو گئے۔ ترقی پسند تحریک سے وابستگی نے ان کو نیا ادراک بخشا۔ عوامی مسائل کی روشنی میں وہ اپنے ذاتی حالات کا مطالعہ کرنے لگے۔ ان کے دل میں موجودہ نظام سے بیزاری پیدا ہوئی۔ وہ طبقاتی سازشوں کو سمجھنے لگے۔ نیک نفسی، دردمندی، بردباری وغیرہ جیسی نعمتیں ان کو فطرت کی طرف سے مل ہی چکی تھیں۔ ان نعمتوں کے سہارے وہ اپنی غریبی اور خستہ حالی کو سرفروشی اور تیغ آزمائی کے لئے آمادہ کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ ان کی شاعری نے ایک نئی کروٹ لی پرانے موضوعات اور رسمی عنوانات سے بیزار ہو کر اشک صاحب عوامی مسائل پر طبع آزمائی کرنے لگے۔ ان کے شعور کی یہ نئی کروٹ اُردو ادب کے لئے مبارک ثابت ہوئی۔ اُردو کے شعری سرمایہ میں ایک گراں قدر اضافہ ہوا۔ اشک صاحب بہت اعتدال پسند آدمی تھے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ تلخیٔ احساس کے باوجود ان کے کلام میں وہ تلخی نہیں، جس کے لئے بعض ترقی پسند شعراء بدنام ہیں۔ سستی قسم کی نعرہ بازی سے بھی اُنکی شاعری کا دامن پاک رہا۔

رنگ سخن کے بدلنے کی کوشش میں اشک صاحب کو بڑے بڑے پیچ در پیچ راستوں سے گذرنا پڑا۔ قدیم و جدید شعراء کے کلام کا مطالعہ نئے دلولوں کے ساتھ کرنے لگے۔ لیکن ان کے ذوق کی کہیں تسکین نہ ہو سکی۔ ان کے فطری میلانات نے انکو نظیر اکبر آبادی کی محفل میں پہنچا دیا نظیر کی آواز ان کے سازِ احساس کو چھیڑنے لگی۔ اور یہ بھی اسی ساز پر نغمہ سرا ہو گئے۔ ظاہر

ہے کہ عوامی شاعری کے لئے نظیر اکبر آبادی سے بہتر اور کون رہنما ہو سکتا تھا۔ نظیر اکبر آبادی کا رنگِ سخن اشک صاحب کی شاعری پر چھا گیا۔ لیکن یہ امر باعثِ مسرت ہے کہ "نظیر پرستی" کے باوجود اشک صاحب کی اپنی انفرادیت ہر جگہ نمایاں رہی۔ وہ نظیر کی آوازِ بازگشت نہیں بنے۔ وہ نقشِ ثانی بن کر بھی نقشِ اول رہے۔ نظیر اور اشک امرتسری کے درمیان صدیاں اور ادوار حائل ہیں۔ زمان و مکاں کے اس فرق نے دونوں کے کلام میں اپنی نوعیت برقرار رکھی اشک صاحب کے حصہ میں نظیر اکبر آبادی کی شگفتگی اور معصومی تو نہ آسکی۔ لیکن بدلے ہوئے حالات اور سیلِ حوادث کی تیزی کی وجہ سے کچھ بادہ تند کی کیفیت ضرور پیدا ہو گئی۔ ایسا ہونا ضروری تھا۔ حالات کی رفتار اسی کا تقاضا بھی کر رہی تھی۔ نرم لہجگی کے باوجود اشک صاحب کے کلام میں احساس کی مرعوب کن اور باوقار گونج بھی سنائی دیتی ہے۔

اشک صاحب نے حیاتِ ارضی اور اس کی ذمہ داریوں پر کافی توجہ صرف کی تھی۔ وہ "آسمان" سے زیادہ "زمین" کی ہم نوائی کرنے لگے۔ ان کی تشبیہیں، علامتیں، کنائے استعارے سب کے سب پروردۂ زمین ہیں۔ آسمان کی مفروضہ بلندیوں کا ان کی تربیت میں کوئی حصہ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اشک صاحب کا کلام خواص و عوام میں بہت مقبول ہوا۔ اور وہ گوشۂ گمنامی سے باہر نکل کر ہر دل عزیزی اور قبولِ عام کی محفل میں پہنچ گئے۔ کلکتہ اور مضافات کے مشاعروں میں ان کا کلام بہت پسند کیا جاتا۔ سامعین بار بار فرمائش کرتے۔ ہندوستان کے دوسرے بڑے شہروں میں اگر کلام سنانے کا موقع ملتا تو ان کی مقبولیت کی سرحد اور وسیع ہو جاتی۔ لیکن حالات نے ان کو کلکتہ سے باہر جا کر مشاعروں میں شریک ہونے

کی اجازت ہی نہ دی ۔

اشک صاحب نے غزلیں بھی کہیں اور نظمیں بھی۔ غزلوں میں بھی ان کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن وہ طبعاً نظم گو تھے۔ نظموں ہی میں ان کا فن شباب کی رعنائیاں دکھاتا ہے

ان کی نظموں میں سب سے زیادہ مقبول اور مشہور نظمیں حسب ذیل ہیں :-

(۱) بنجارہ نامہ	(۲) ردی ٹ
(۳) آدمی	(۴) پیسہ
(۵) ٹن ٹن ٹن	(۶) غوں غاں غوں غاں
(۷) ہلہ آتا ہے	(۸) بہارِ کلکتہ

افسوس ہے کہ کینسر جیسے موذی مرض نے اشک صاحب کو قبل از وقت ہم لوگوں سے جدا کر دیا۔

؎ کاش کچھ اور وہ جئے ہوتے

انجمن ترقی اُردو (ہند) شاخ کلکتہ نے "سیلِ اشک" شائع کر کے مرحوم کے فن پاروں کو آئندہ نسلوں کے لئے محفوظ کر لیا ہے ۔ اس کی یہ کوشش قابلِ ستائش ہے ۔

اب میں قارئین اور اشک صاحب کے کلام کے درمیان دیوار بن کر حائل رہنا نہیں چاہتا۔ قارئین گرامی سے یہ کہتے ہوئے۔ کہ "اشک صاحب کا کلام آپ کو دعوتِ

مطالعہ دے رہا ہے" رخصت کی اجازت چاہتا ہوں۔

پروفیسر پرویز شاہدی
صدر شعبۂ اردو۔ کلکتہ یونیورسٹی

ٹن ٹن ٹن

ٹن ٹن ٹن ٹن ٹن ٹن ٹن

شاعر یہ کیسی اُلجھن　　یہ کیسا دیوانہ پن!
رکشے پر بھی مشقِ سخن　　تیری گھنٹی ہے قدغن

ٹن ٹن ٹن ٹن ٹن ٹن ٹن

سُن اے شعر و سخن کے رب　　تجھ کو ملے گی فرصت کب
آہ نہیں چھپتی ہے اب　　ٹُن ٹُن میں دل کی دھڑکن

ٹن ٹن ٹن ٹن ٹن ٹن ٹن

دل میں نغمہ نو کی دھن　　لب پر فعلن مفعولن
چھوڑ یہ سب اور میری سن　　بحرِ ادب کے غوطہ زن

ٹن ٹن ٹن ٹن ٹن ٹن ٹن

میں نکلا اپنے گھر سے　　چھوڑ کے بیوی اور بچے
بیچ کے چاندی کے چھلے　　جبر اُٹھا مجبور ا

ٹن ٹن ٹن ٹن ٹن ٹن ٹن

بخت نے یوں پلٹا کھایا! کھینچ کے کلکتے لایا!
اور پلٹ ہی وہی کایا روح مکالی، رکھا تن

ٹن ٹن ٹن ٹن ٹن ٹن ٹن

آئندہ جو ہو سو ہو لادے پھرتا ہوں اب تو
اپنے رکشے پر اُن کو لاش ہے جن کی دو دو من

ٹن ٹن ٹن ٹن ٹن ٹن ٹن

راہ کٹھن چلنا مشکل چور بدن اور خون ہے دل
اس پر محنت کا حاصل موت ہے اور بے گور و کفن

ٹن ٹن ٹن ٹن ٹن ٹن ٹن

آگ برستی تپتی راہ!! پاؤں میں چھالے لب پر آہ
سرخ ہیں آنکھیں، رنگ سیاہ قلب و جگر سنگ و آہن

ٹن ٹن ٹن ٹن ٹن ٹن ٹن

تیری نظر میں ذوقِ طلب دل میں ہوائے عیش و طرب
شوق وصالِ بنتِ عنب حسنِ بتانِ سیمیں تن

ٹن ٹن ٹن ٹن ٹن ٹن ٹن

تیری نظر میں عرشِ علٰے تیری نظر میں امریکا
لندن پیرس کا نقشا رقصِ بتانِ زہرہ سکن

ٹن ٹن ٹن ٹن ٹن ٹن ٹن

میری نظر میں نوعِ بشر　　بے کسئ اربابِ ہنر
ذلّت و خوارئ اہلِ نظر　　حالِ خرابِ اہلِ وطن

ٹن ٹن ٹن ٹن ٹن ٹن ٹن

تیری نگاہوں سے مستور　　مردِ تہی دامن مزدور
بندۂ معتوب و مقہور　　فاقہ کش بےکس نرِ دَہن

ٹن ٹن ٹن ٹن ٹن ٹن ٹن

جا، اے میرے شاعر! جا　　تصویروں سے دل بہلا!
وہ ہے پھاٹک مسٹر دِ کا　　صف در صف ہیں مرد و زن

ٹن ٹن ٹن ٹن ٹن ٹن ٹن

اشک سے خموش، اب رہنے دے　　کون سنے گا یہ قصے
ایسا گیت سنا جس سے　　جھوم اُٹھے لیلائے سخن

ٹن ٹن ٹن ٹن ٹن ٹن ٹن

بنجارہ نامہ

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائیگا جب لاد چلیگا بنجارہ

کیا دشت و دمن کیا سرو وسمن کیا صحنِ چمن کیا فوارہ
کیا شیشہ و مے کیا نغمہ و نے کیا رقصِ بتانِ مہ پارہ
کیا بنتِ عنب کیا سازِ طرب کیا ڈھولک نوبت نقارہ
کیا ایڑلیس، کیا ریڈیو سیٹ، کیا پیانو، بنجو، اکتارہ
سب ٹھاٹ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ

کیا مال، خزانہ، دھن، دولت کیا ہیرے، موتی لعل گہر
کیا دھوم دھڑکا دولت کا، کیا ملک و متاع و بحر و بر
کیا چھکڑے، ٹھیلے اور یکے کیا ہاتھی گھوڑے اور خچر
کیا ریل، سڑک، موٹر، لاری، کیا اسٹیمر، کیا طیارہ
سب ٹھاٹ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ

کیا دورِ جہالت کے بندھن، کیا عہدِ رواں کی زنجیریں
کیا قارونوں کا سرمایہ، کیا شدادوں کی جاگیریں
کیا عرش سے ملتے محل و مکاں، کیا فرش پہ ہنستی تعمیریں
کیا سُود کی گٹھڑی، لوبھ کا بقچہ، منصوبوں کا پشتارہ
سب ٹھاٹ پڑا رہ جائیگا۔ جب لاد چلے کا بنجارہ

کیا چالیں مکر و سیاست کی، کیا جنگ و جدل کی تیاری
کیا مہلک حربے سائنس کے اور کیا گیسوں کی بمباری
کیا آگ اگلتے اُڑن کھٹولے اور برستی بیماری!
کیا پھٹتے ایٹم، اُڑتے راکٹ، بہتے ڈالر کا دھارا
سب ٹھاٹ پڑا رہ جائیگا۔ جب لادے گا بنجارہ

کیا تیل کا چشمہ، پاٹ کی کھیتی، کاٹھ کے بن، اور کیا جنگل
کیا جنگی اڈہ، بحری بیڑا، امدادی دستہ، دمکل
کیا گندھک اور بارود و بجن، کیا دھات کا معدن، کیا جنگل
کیا لوہا، سونا، سیسہ، کانسہ، پیتل، تانبہ اور پارہ !!!
سب ٹھاٹ پڑا رہ جائے گا جب لادے گا بنجارہ

"تُو ہی تو ہے رکھتی بنجارہ اور کھیپ بھی تیری بھاری ہے"
تیرا ہی فرمان ہے جو تہذیب کے جگ میں جاری ہے

تیرے ہی زر کے زور سے دنیا ساری آج بھکاری ہے
یاد رہے ہم فاقہ کشوں کے دم سے ہے تیرا بھنڈارہ
سب ٹھاٹ پڑا رہ جائیگا۔ جب لاد چلے گا بنجارہ
تو رہنے والا پچھم کا ہے، پورب تک آجاتا ہے
ہم سورج پیدا کرتے ہیں تو اندھیرا پھیلاتا ہے
ہم محنت سے ان بستے ہیں تو حکمت سے پھل کھاتا ہے
تو جتنا بڑا ہے علامہ اتنا ہی بڑا ہے، ہتھیارا
سب ٹھاٹ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ
جب نیند کے ماتے جاگیں گے جب جنتا کروٹ بدلے گی
جب چلتی پھرتی لاشوں میں تڑپے گی روحِ آزادی
کچھ کام نہ تیرے آئے گی پولیس پلٹن سی آئی ڈی!
جب شاعر شعلے اُگلے گا۔ جب گیت بنے گا انگارہ
سب ٹھاٹ پڑا رہ جائے گا جب لادے گا بنجارہ
جب امن کا جھنڈا لے کر اٹھیں گے فٹ پاتھوں کے شہزادے
جب قیصر و کسریٰ سے اپنا حق چھینیں گے بھوکے ننگے
جب جہد و عمل سے بند کیے جائیں گے سحر کے دروازے
کھا جائے گا زنگ مشینوں کو ہو جائیگا لشکر ناکارہ

سب ٹھاٹ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ

اُس وقت زمین کی دولت میں حصہ نہ کسی کا کم ہوگا !
ہر شیشہ صنعتِ اسکندر ہر کوزہ جامِ جم ہوگا
انصاف کی چوکھٹ پر آخر عمامۂ نخوت خم ہوگا
ہاں جنگ کے ٹھیکیداروں کا دل ہو جائے گا سی پارہ
سب ٹھاٹ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ

آدمی

(بزبان نظیر اکبر آبادی)

گردوں پہ اُڑ رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی — رکشے پہ جو چڑھا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
گردش میں مبتلا ہے سو ہے وہ بھی آدمی — جو اس کو کھینچتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
ہے آدمی جو غرق جواہر ہے سر بسر
ہے آدمی جو ٹھوکریں کھاتا ہے دربدر

زردار زر پرست ہے سو وہ بھی آدمی — مستِ مئے الست ہے سو وہ بھی آدمی
نادار تنگ دست ہے سو وہ بھی آدمی — گانجے کی دھن میں مست ہے سو وہ بھی آدمی
وہ بھی ہے آدمی کہ جو ہے شہ نشین پر
وہ بھی ہے آدمی جو پڑا ہے زمین پر

ہیں آدمی خضرؑ بھی رسولِ انامؐ بھی — ہیں آدمی مشائخ عالی مقام بھی
ہیں آدمی صحابۂ ذوالاحترام بھی — ہیں آدمی حسینؑ علیہ السلام بھی
شمر و یزید و خولی غدار آدمی
ابنِ ولید و حیدرِ کرار آدمی

ملزم، وکیل، منصف و مختار آدمی
شاعر، ادیب، ناظم و نثار آدمی
مفلس، کسان، سیٹھ، زمیندار آدمی
کاتب، مدیر، مالکِ اخبار آدمی
پردھان منتری ہے سو ہے وہ بھی آدمی
دربان سنتری ہے سو ہے وہ بھی آدمی

ہے آدمی شکار، شکاری بھی آدمی
عیاش، بدقماش، جواری بھی آدمی
داتا، سخی، فقیر، بھکاری بھی آدمی
قاری بھی آدمی ہے پجاری بھی آدمی
ہے آدمی سے زندۂ جاوید شیطنت
اور آدمی کے دم سے ہے یزداں کی سلطنت

فرعونِ مصر و حضرتِ موسیٰؑ بھی آدمی
پست و ذلیل و خوار بھی رسوا بھی آدمی
نارد منی بھی کرشن کنھیاؐ بھی آدمی
بالا، بلند، ارفع و اعلیٰ بھی آدمی
ہے آدمی جو مظہرِ ذات و صفات ہے
ہے آدمی جو بندۂ لات و منات ہے

ہے آدمی جو موٹریں رکھتا ہے چار چار
ہے آدمی جو عیش سے رہتا ہے ہم کنار
ہے آدمی جو دوڑتا پھرتا ہے بے مہار
ہے آدمی جو رات کو روتا ہے زار زار
کیسے کہوں کہ بندۂ زر آدمی نہیں
اشکِ خراب حال مگر آدمی نہیں

ہلّہ آتا ہے

جو بوتا ہے دُکھ پاتا ہے ! : جو سوتا ہے سو کھاتا ہے
کیوں الٹے گیت سناتا ہے ! : اور بیچ سڑک کے گاتا ہے
اُٹھ بھاگ کہ ہلہ آتا ہے

یہ شہر بڑا ہے کلکتہ ! : وہ شخص ہے مورکھ البتہ
جو تمھاری کپڑا لتہ فٹ پاتھ پہ یوں پھیلاتا ہے
اُٹھ بھاگ کہ ہلہ آتا ہے

تو بھوکا ننگا بیوپاری اور بیچے بھجیا ترکاری
لیکن یہ سڑک ہے سرکاری قانون تجھے دوڑاتا ہے
اُٹھ بھاگ کہ ہلہ آتا ہے

تو کرکے اکٹھا مرد و زن کیوں بجتا ہے مسی منجن
ہوتی ہے ٹرانک میں الجھن رستہ سارا گھر جاتا ہے
اُٹھ بھاگ کہ ہلہ آتا ہے

گھر بیٹھے لوگ کماتے ہیں — اور سو سے لاکھ بناتے ہیں
سرکار کو ٹیکس دلاتے ہیں — تو بچتا ہے کھا جاتا ہے
اُٹھ بھاگ کہ ہلہ آتا ہے

اس کرّ و فر کی دنیا میں — اس مکر و شر کی دنیا میں
اس زور و زر کی دنیا میں — کمزور سے کس کا ناتا ہے
اٹھ بھاگ کہ ہلہ آتا ہے

سب لوگ ہیں بدلے تو بھی بدل — اب سیکھ "بلیک" کپٹ اور چھل
چل، مکر و فریب کی چالیں چل — کیوں اشک کما کر کھاتا ہے
اٹھ بھاگ کہ ہلہ آتا ہے

فقیر کی صدا

کچھ راہ خدا پر دے بابا کچھ راہ خدا دلوا بابا

پڑتے ہی قدم درویشوں کے ہوتی ہے دور بلا بابا
کھلتا ہے باب اجابت کا، ہوتی ہے قبول دعا بابا
رمضان کے روزے بیت گئے اور عید کا دن آیا بابا
ہم مست قلندر درویشوں کا چنبل بھرتا جا بابا !!!
کچھ راہِ خدا پر دے بابا، کچھ راہ خدا دلوا بابا

آباد رہے یہ بستی جس میں ناچتی ہیں جھوٹی خوشیاں
آباد رہے یہ منڈی جس میں سستے بکتے ہیں انساں
آباد رہے بھوکی نگری، آباد رہیں یہ محل و مکاں
ہم تیرے ٹکڑوں کے مارے ہیں ہم کو بھول نہ جا بابا
کچھ راہِ خدا پر دے بابا، کچھ راہ خدا دلوا بابا

آباد رہیں یہ کھیت کہ جن کی مٹی بھوک اگلتی ہے
آباد رہیں یہ ہل کہ جہاں ٹکڑوں پر محنت پلتی ہے

آباد رہیں یہ دفتر جن میں ذہن کی کھیتی جلتی ہے
آباد رہے سنسار کہ جس کا ہر نقشہ الٹا بابا
کچھ راہ خدا پر دے بابا، کچھ راہ خدا دلوا بابا

ہے عید کا دن دیگیں ہیں چڑھی اور گرم ہیں باورچی خانے
ہے عید کا دن اور کھنک رہے ہیں مئے خانوں میں پیمانے
ہے عید کا دن اور ناچتے ہیں زر کی دیوی کے دیوانے
سر پھوڑ رہے ہیں پروانے، گل ہو گئی شمعِ وفا بابا!
کچھ راہ خدا پر دے بابا، کچھ راہ خدا دلوا بابا

ہے عید کا دن اور دھوم مچی ہے تیری امارت کی ہر جا
ہے عید کا دن اور بھوکوں میں ہے تیری سخاوت کا چرچا
ہے عید کے دن بھی اپنے یہاں درپیش وہی رونا دُکھڑا
الٹا ہے توا، اوندھی ہنڈیا، چولہا ہے پڑا ٹھنڈا بابا
کچھ راہ خدا پر دے بابا، کچھ راہِ خدا دلوا بابا

یہ عید گذر ہی جائیگی، حالات بدل ہی جائیں گے
اس طرۂ پرپیچ و خم کے سب پیچ نکل ہی جائیں گے
ہم گرتے پڑتے بڑھتے ہیں گر گر کے سنبھل ہی جائینگے
تو آپ نہ بدلا اب بھی اگر تو وقت بدل دے گا بابا

کچھ راہ خدا پر دے بابا، کچھ راہِ خدا دلوا بابا

اب طوق پگھلتے جائیں گے زنجیریں کٹتی جائیں گی
قانون بدلتے جائیں گے تقدیریں گھٹتی جائیں گی
سرمایہ بکھرتا جائے گا جاگیریں بٹتی جائیں گی
کل تیرے دوارے ہاتھ پسارے کوئی نہ آئے گا بابا
کچھ راہِ خدا پر دے بابا، کچھ راہ خدا دلوا بابا

اب مست فقیروں کی ہمت اربابِ ہوس سے عالی ہے
اب خاک نشینوں کے ذمے اِس دیس کی دیکھا بھالی ہے
اب پار نہ ہوگا بیڑا جب تک ایک بھی کاسہ خالی ہے
لے ہم نے ترے دروازے پر اب گاڑ دیا جھنڈا بابا
کچھ راہ خدا پر دے بابا، کچھ راہِ خدا دلوا بابا

اب ذہن ہمارے روشن ہیں وہ تیرگیٔ اوہام نہیں
اب عشق جنوں کی منزل میں ہے حرص و ہوس کا نام نہیں
اب تیرے فتنے عام ہوئے تقدیر پہ کچھ الزام نہیں
اب دیر تو ہو سکتی ہے۔ مگر اندھیر نہیں ہوگا بابا
کچھ راہِ خدا پر دے بابا، کچھ راہِ خدا دلوا بابا

مت پوچھ کہ اب کیوں دھوم مچی ہے اشکؔ ایسے فنکاروں کی

وہ دیکھ کہ تارے کانپے نبضیں چھوٹ گئیں اندھیارے کی
یہ دیکھ کہ آخر جوش میں غیرت آ ہی گئی ناداروں کی

رکھ یاد کہ پورا ہو کے رہے گا قول فقیروں کا بابا
کچھ راہِ خدا پر دے بابا، کچھ راہِ خدا دلوا بابا

خدمتِ وطن

سیاستِ فرنگ کا فریب فاش ہو چکا
وہ داستانِ فتنہ و فساد و شور و شر نہ کہہ
وطن سے عشق ہے تو اٹھ ہو وقفِ خدمتِ وطن
نہ ہاتھ رکھ کے ہاتھ پہ خموش ہو کے بیٹھ رہ

غوں غاں غوں غاں

میری زباں پہ سرِ نہاں　　میرے بیاں میں ذکرِ جناں
کاش سمجھتا کوئی یہاں　　عرشِ معلّٰی کی یہ زباں
غوں غاں غوں غاں غوں غوں غاں

حسنِ مجسم ہر ذرّہ　　ہر ذرّے میں شانِ خدا
حور و ملائک صلِّ علیٰ　　جوئے شراب و شہد رواں
غوں غاں غوں غاں غوں غوں غاں

قصرِ جنت سر تا سر　　لعل و الماس و گوہر
سیمیں گنبد زریں در　　پہرے پہ فوجِ غلماں
غوں غاں غوں غاں غوں غوں غاں

لاہوتی نغمہ یا ہو　　ملکوتی لے تو ہی تو
ہر دم ہر لحظہ ہر سو　　بارشِ انوارِ یزداں
غوں غاں غوں غاں غوں غوں غاں

ہا ہا ہو ہو ہا ہا ہو   یہ دنیائے رنگ و بو
یہ تفریق ما و تو   خوب و خراب و خورد و کلاں

غوں غاں غوں غاں غوں غوں غاں

آنکھ کھلی انسانوں میں   مذہب کے ایوانوں میں
آج ہی میرے کانوں میں   گونج گئی آوازِ اذاں

غوں غاں غوں غاں غوں غوں غاں

یہ دنیا ہے وہ دنیا   یہ ادنیٰ ہے وہ اعلیٰ!
یہ بندہ ہے وہ آقا!   یہ ابا ہیں وہ اماں

غوں غاں غوں غاں غوں غوں غاں

اس دنیا میں ہیں باہم!   صبحِ مسرت شامِ غم
بیش و کم کا شہد و سم   حرص و ہوائے سود و زیاں

غوں غاں غوں غاں غوں غوں غاں

روتا ہوں جب دیکھتا ہوں   شعبدۂ دنیائے دوں
سیم و طلا و زر کا فسوں   اوجِ و عروج بے ہنراں

غوں غاں غوں غاں غوں غوں غاں

یہ اندھیرا یہ اندھیر   سرتا سر دانش کا پھیر
سرکش گیدڑ بزدل شیر   انساں کا دشمن انساں!

غوں غاں غوں غاں غوں غوں غاں

عشق و جنوں ہی قید و بند — حرص و ہوس ہی شہد و قند
وقفِ کشاکش دانش مند — دانش و حکمت سرگرداں

غوں غاں غوں غاں غوں غوں غاں

سونے کے مندر منبر — بت کے سر پہ تاجِ زر
مخمل و اطلس زیبِ خر — اولادِ آدم عریاں

غوں غاں غوں غاں غوں غوں غاں

خم ہے درِ باطل پہ جبیں — وہم و گماں میں گم ہے یقیں
رقص میں ہے ابلیس لعیں — پردۂ اسریٰ میں یزداں

غوں غاں غوں غاں غوں غوں غاں

خاک بسر ہیں اہلِ کمال! — جینا ہے جی کا جنجال!
اشک سے شاعر کا یہ حال — واہ مرے اللہ میاں

غوں غاں غوں غاں غوں غوں غاں

پیسہ

اے اشک ذرا سُن تو سہی میری زبانی
یہ کیا کہا پیسہ کی کہانی ہے پرانی!
کل تک نہ رہے گی مگر اب تک تو ہے باقی
قارون کی یہ زندہ و تابندہ کہانی

خلاقِ زر و سیم کا شہکار ہے پیسہ
ہر مدح و ستائش کا سزادار ہے پیسہ
ہر موقعِ مشکل میں مددگار ہے پیسہ
ہر شخص کو ہر حال میں درکار ہے پیسہ
دلبر ہے دل آرام ہے دلدار ہے پیسہ

تانبے کا یہ پیسہ ہے کہ معشوقِ طرح دار
جس کے خمِ گیسو میں زمانہ ہے گرفتار
رقصاں ہے سرِ بزم درخشاں سرِ بازار
طبلے کی کہیں تال، کہیں تیغ کی جھنکار
القصّہ کہیں نور، کہیں نار ہے پیسہ!

پیسے کی بدولت ہے یہ سب شوکت و حشمت
پیسہ ہو تو دنیا بھی ہے چشمک زنِ جنت
پیسے ہی سے حاصل ہے جہالت کو فضیلت
کس کو نہیں معلوم ہے پیسے کی حقیقت
دنیا میں حقیقت ہے تو اے یار ہے پیسہ

پیسہ ہے تو کیا مال ہے وہ تاج ہو یا تخت
ماہیّتِ اشیاء کو بدل دیگا ترا بخت
پیسہ ہو تو دشوار نہیں مرحلۂ سخت
قانون کی یورش بھی اگر تجھ پہ ہو یک لخت
پیسے کی لگا ضرب کہ تلوار ہے پیسہ

پیسے کی فضیلت سے کسی کو نہیں انکار
پیسے کی بدولت ہیں یہ سب گنبد و مینار
پیسے کہ دِرنازہ یہ خم طرّۂ دستار
پیسے کا ہے محتاج مُفکّر ہو کہ فن کار
افکارِ گُہر بار پہ اسوار ہے پیسہ

پیسے سے ہے یہ سلسلہ شمشیر و سناں کا
پیسے سے ہے یہ مسئلہ جاگیر و مکاں کا

پیسے سے ہے یہ مشغلہ تسخیر جہاں کا
پیسے سے ہے یہ غلغلہ ناقوس و اذاں کا!
ہے خیر میں گم، شر میں نمودار ہے پیسہ

پیسے کی یہ تصویر ہے فرضی نہ خیالی!
پیسے کے مراتب ہیں بہت ارفع و عالی
پیسے کے یہ گل بوٹے ہیں پیسے کا ہے مالی
اس شہر میں ہر شخص ہے پیسے کا سوالی
پیسے کا ہے بازار، خریدار ہے پیسہ

پیسے کو بُرا کہتے ہو اندھیر ہے کیسا،
پیسہ تو میاں اشکؔ نہ ایسا ہے نہ ویسا
پیشانیٔ مزدور پہ لکھا ہے کچھ ایسا
ملتا ہے جو محنت سے وہی پیسہ ہے پیسا
پیسے سے رہو دُور کہ مردار ہے پیسہ

آئی لو اُردو

"بوائے ! بوائے !" "یس سر! یس سر!"

"وھسکی، برانڈی، سوڈا واٹر ٹوسٹ، پوٹیٹو اینڈ ٹماٹر

ہری اپ، جلدی بیرا بٹلر"

"بوائے! بوائے!" "یس سر! یس سر!"

"اُردو کا ہم شاعر، بوائے! آئی ایم گوئنگ ٹو اٹینڈ اے

اُردو کانفرنس آف کلچر!!"

"بوائے! بوائے!" "یس سر! یس سر!"

"ہم تو ہیں شانی یزدانی! فیمس شاعر ہندوستانی

یعنی فادر آف لٹریچر"

"بوائے! بوائے!" "یس سر! یس سر!"

"دنیا جانے ہٹ ینورے یو   آئی لو اُردو، آئی لو اُردو
اُردو لوّلی، سویٹ اینڈ بیرڈ"
بوائے! بوائے!" "یس سر! یس سر!"

"بوائے! ہم پر موڈ ہے طاری   کانفرنس کی ہے تیاری
ہیو یو گاٹ اے پیس آف پیپر؟"
"بوائے! بوائے!" "یس سر! یس سر!"

"سوری، بوتل ہوگئی خالی   ناؤ آئی وانٹ اے چائے کی پیالی
پاکٹ پائی لیس، امپٹی ساغر"
"بوائے! بوائے!" "یس سر! یس سر!"

ڈھول

دنیا ڈالڑاں ڈول ہے بابا، دنیا ڈالڑاں ڈول

پکی سچی بات سنا دے ڈینگ نہ مارے ڈھول
تال اسی کی، راگ اُسی کا جس کے اونچے بول
نام اُسی کا جگ میں جس کا کھل نہ سکا ہو پول
ڈھول کا دم خم دنیا دیکھے، کوئی نہ دیکھے خول
دنیا ڈالڑاں ڈول ہے بابا، دنیا ڈالڑاں ڈول

ڈھول بجا کر ہم نے جگایا جاگ رہے ہندی جاگ
بھائی بھائی مل کے رہیں گے جاگ انہیں گے بھاگ
ہندو مسلم کوئی نہ سمجھا شاعر کا یہ راگ
موت کی آندھی آئی آخر دوزخ کے پٹ کھول
دنیا ڈالڑاں ڈول ہے بابا، دنیا ڈالڑاں ڈول

موت کی آندھی ایسی آئی جیسے بھوکا شیر
ہند اور پاکستان کو گویا کر گئی راکھ کا ڈھیر
آگ لگی ہر جانب اور ہر سمت ہوا اندھیر

انسانوں کے روپ میں نکلا شیطانوں کا غول
دنیا ڈانواں ڈول ہے بابا، دنیا ڈانواں ڈول

پریم کے پرچارک ہیں دونوں وید ہو یا قرآن
پریم ہی شکتی، پریم ہی مکتی، پریم شری بھگوان
عشقِ الٰہی پر قائم اسلام کا ہے ایوان!
یہ موتی انمول ہیں ان کو من ہی من میں تول
دنیا ڈانواں ڈول ہے بابا، دنیا ڈانواں ڈول

نیا زمانہ آیا ہے اب نئے سناؤ گیت
نئے جہاں کی نئی ہیں رسمیں نئی ہے جگ کی ریت
نئی ادا سے گھرے ہیں بادل برس رہی ہے پریت
نئے ادب میں تو بھی شاعر امرت کا رس گھول
دنیا ڈانواں ڈول ہے بابا، دنیا ڈانواں ڈول

نفرت کا وہ دور گیا، سن اے مردِ معقول
پت جھڑ کی وہ آندھی تھی اب جاؤ اس کو بھول
نئی بہاریں آئیں گی اب نئے کھلیں گے پھول
نئی دھنوں میں سنا کر دگے اشک پیا کے بول
دنیا ڈانواں ڈول ہے بابا، دنیا ڈانواں ڈول

زر علیہ السلام

مرا نام ہے زر علیہ السلام — بلند اور بالا ہے میرا مقام
مجھے پیار سے لوگ کہتے ہیں دھن — مرے سر پہ رحمت ہے سایہ فگن!
مرے دم سے ہے گردشِ جامِ زر — مرے دم سے عیش و طرب کرّ و فر
مرے دم سے یہ مشک و عنبر یہ عود — یہ بادہ یہ ساغر یہ رقص و سرود
مرے دم سے دنیا کی رنگینیاں — مرے دم سے گلشن میں گلچینیاں!
مرے حکم سے عصمتوں کے گہر — لٹائے گئے ہیں سرِ رہ گذر
مٹائے گئے دوستی کے نشاں! — بہائی گئیں خون کی ندیاں

فضیلت ہوس کو عطا کی گئی!
محبت کی بنیاد ڈھا دی گئی!

ہمیشہ نئے گل کھلاتا ہوں میں — گناہوں کو رنگیں بناتا ہوں میں
میں دیتا ہوں تعلیمِ جنگ و جدال — دکھاتا ہوں قوموں کو راہِ زوال
فنا کے ڈگر پر چلاتا ہوں میں — رہِ راستی سے ہٹاتا ہوں میں
بناتا ہوں میں جن کو اپنا مرید — وہ لیتے ہیں عقبےٰ میں جنت خرید
بناتے ہیں دنیا میں قصرِ بلند — کہ ڈالیں زمیں سے فلک پر کمند
بناتا ہوں جاہل کو صدر الصدور — دلاتا ہوں کافر کو حور و قصور

بلندی پہ ہے آج میرا علم ! نگوں سر ہیں اربابِ سیف و قلم
بناتا ہوں دنیا کو اپنا غلام تڑپتے ہیں قدموں پہ میرے عوام
حقیقت ہے کیا مردِ مزدور کی کہ گردن خمیدہ ہے فغفور کی
کلیسا ہو مسجد ہو یا سومنات مورخ ہو یا عالمِ دینیات
شہنشاہِ حکمت امیرِ ادب مرے زیرِ فرماں ہیں وہ سب کے سب

جہاں میں ہے جب تک یہ رسم اور رواج
جہاں کو رہے گی مری احتیاج

مرا بول بالا رہے گا یہاں ہنسے گا بہاروں پہ عہدِ خزاں
مسلط رہیں گی یہ تاریکیاں کہ ہو حرفِ باطل پہ حق کا گماں
مری شان و شوکت مرا طمطراق اُڑے گا اہلِ قلم کا مذاق !
یہ ممکن ہے تم کو ہو کچھ قیل و قال بہرحال میرا یہی ہے خیال

جو اب مجھ کو حاجت روا مان لیں
عجب کیا کہ اک دن خدا مان لیں

دُکھیا سب سنسار

(تضمین بر مصرعِ گرو نانک صاحب)

یہ تیری دنیا ہے یارب! یہ تیرا شہکار!
یہ تیرے بندے ہیں، بے کس بے بس اور لاچار
جن بندوں کے دم سے رشکِ جنت ہیں کہسار
خونِ دہقاں سے ہے سارا عالم لالہ زار
دکھیا سب سنسار ہے نانک! دکھیا سب سنسار

یہ کیسا نظمِ ہستی ہے، یہ کیسی تقدیر!
یہ تیری دنیا ہے دولت مندوں کی جاگیر
اس دنیا میں ناداری ہے سب سے بڑی تقصیر
یہ کیسی ناانصافی ہے کیسا اتیاچار!
دکھیا سب سنسار ہے نانک! دکھیا سب سنسار

اس دنیا میں ایک طرف ہیں سر بفلک ایوان
ایک طرف ہیں ٹوٹی پھوٹی کٹیائیں ویران
ایک طرف ہیں جشنِ عیش و عشرت کے سامان
چار طرف زندان فاقہ کش کی چیخ پکار
دکھیا سب سنسار ہے نانک! دکھیا سب سنسار

یہ رات ظلمات کی ہے یا میرے وطن کی بھور
پھول کہاں کے، بلبل کیسی، کیسے چاند چکور
بول رہے ہیں باغ میں اُلّو، کوّوں کا ہے شور
کون ہے جو آزاد فضاؤں میں گائے ملہار
دکھیا سب سنسار ہے نانک، دکھیا سب سنسار

اس دنیا کے گلشن کا ہر پھول ہے بس کی پوٹ
اس دنیا کے سندر چہروں کے من میں ہے کھوٹ
جنگ و جدل کا ساماں ہے اور امن و اماں کی اوٹ
مخمل میں بارود چھپا ہے اطلس میں تلوار!
دکھیا سب سنسار ہے نانک! دکھیا سب سنسار

روپ میں رشیوں کے یاں جلوہ گر من بھانے گھاگ
یا دولت کے ڈھیروں پر بیٹھے ہیں کالے ناگ

پھن پھیلائے جھوم رہے ہیں سُن سُن کر یہ راگ
جھن جھن جھن جھن جھن جھن جھن جھن مایا کی جھنکار
دکھیا سب سنسار رہے نانک! دکھیا سب سنسار

چیلے ہیں یہ نارد کے جو ڈال رہے ہیں پھوٹ
بندے ہیں ابلیس کے جن کی گھٹی میں ہے جھوٹ
جب چاہیں تب آگ لگادیں اور مچادیں لوٹ
لعنت ہے ان بندوں پر، ان چیلوں پر پھٹکار
دکھیا سب سنسار رہے نانک! دکھیا سب سنسار

روزہ رکھو منت کا یا بھوگ چڑھاؤ بھوگ
اب نہ بچے گی ظلم کی دیوی سوگ مناؤ سوگ
اس کی رگوں میں خون نہیں ہے روگ بھرا ہے روگ
اس کے لئے دارو ہے چتا کی آگ عذاب النار
دکھیا سب سنسار رہے نانک! دکھیا سب سنسار

بھوکا ہندستان

بھوکا ہندستاں ہے، بابا بھوکا ہندستان

جنت تھا یہ دیس کبھی اب جس کی ہے یہ شان
بھوکے، ننگے مارے مارے پھرتے ہیں انسان
ہُو کا عالم حیرت، ہیبت، سناٹا، سنسان!
اُتر، دکھن، پورب، پچھم ہر کونا ویران
بھوکا ہندستان ہے، بابا بھوکا ہندستان

یوپی ہو یا سی پی ہو، پنجاب ہو یا بنگال!
ہریالی کس دیس میں ہے اور کون ہے یاں خوشحال
دھرتی کی اس جنت میں بھی پھیل گیا ہے کال!
جینا ہے جنجال، کہ سوکھے کھیت، جلے کھلیان!
بھوکا ہندستان ہے! بابا بھوکا ہندستان

بھوکے ننگے دیس کی لیکن یہ کیسی ہے ریت
سب کو سب سے ان بن ہے یاں کون ہے کس کا میت
دین دھرم کے دیوانوں میں ملی نہ ہم کو پریت
ہندو مسلم ہیں بہتیرے کمتر ہیں انسان

بھوکا ہندستان ہے، بابا بھوکا ہندستان

دھوم مچی ہے سارے جگ میں، ہند ہوا آزاد
اونچے اونچے عہدوں پر ہیں جنتا کے افراد
کٹیا چھوڑ، کیے نیتاؤں نے بنگلے آباد
جنتا کے دکھ بھول گئے وہ دیکھ کے اپنی شان
بھوکا ہندستان ہے، بابا بھوکا ہندستان

آج بھی پستی ذہن میں ہے اور آج بھی دل سے تنگ
آج بھی من کے درپن پر ہے کالا کالا زنگ
آج بھی وہ سب کچھ ہے یہاں جو چھوڑ گئے افرنگ
آج بھی انسان سستا ہے اور مہنگا سب سامان
بھوکا ہندستان ہے، بابا بھوکا ہندستان

دُکھیا کا یہ حال، نہ جیتا چھوڑے ان کی بھوک
مکھیا کا یہ لوبھ، کہ بڑھتی جائے دھن کی بھوک
شاعر کا یہ گیت، کہ جس سے بھڑکے من کی بھوک
بھوک کی اگنی پھونک نہ ڈالے یہ اونچے ایوان
بھوکا ہندستان ہے، بابا بھوکا ہندستان

منطق الحیوانات

کیا خبر تھی کہ میں انسانوں میں گھبراؤں گا
شہر سے دور کسی دشت میں ڈیرا ہو گا
شب تاریک بسر ہو گی درندوں کے ساتھ
اور چڑیوں کے ترنم میں سویرا ہو گا

نہ یہاں نعرۂ جے ہند، نہ بانگِ تکبیر
پھر یہ ہنگامہ سا کیا ہے متحیر ہوں میں
ناگہاں "بھن" سی مرے کان میں آواز آئی
"جس نے نمرود کا سر کچلا وہ مچھر ہوں میں"

سنگریزوں میں سرکتے ہوئے بچھو نے کہا
پر سچ ہے بد اچھا ہے بدنام بُرا ہوتا ہے
زہر میرا نہیں مہلک یہ تعصب ہے وہ سم
جس سے مٹ جاتا ہے دیں ملک فنا ہوتا ہے

سگِ لیلیٰ نے کہا "قیس کے سر کی سوگند
میں نے معیوب نہ سمجھا کبھی کُتا ہوتا
مری فطرت میں ازل سے ہے وفا کا جوہر
آدمی کو ہو مُبارک سگِ دنیا ہونا"

لومڑی سے یہ کہا شیرِ ببر نے کہ "جناب — دن بڑا ہوتا ہے یا رات بڑی ہوتی ہے"
ہنس کے بولی "یہ بزرگوں سے سنا ہے میں نے — کہ بڑے لوگوں کی ہر بات بڑی ہوتی ہے"

ایک طوطا کہ "سند یافتۂ زنداں" تھا! — کہہ رہا تھا کہ "بشر میں ہے فراست آئی
قفسِ زر کو پلٹ کر جو نہ دیکھا میں نے — میرے صیاد نے سمجھا اسے طوطا چشمی"

یوں کہا چیل نے کوّے سے کہ یہ مان لیا — زردِ مکار ہیں، بدکار ہیں، بد ہیں ہم ہیں
جب کہ انساں نے بنایا ہے لٹیروں کو امیر — پھر غلط کیا ہے کہ اس دور کے شاہیں ہم ہیں

اِک طرف دور سے طوفانِ ترنم اُمڈا — غل ہوا بلبلِ بستان وبیاباں آئی
جھاڑیاں جھوم اٹھیں ہو گیا سبزہ بیدار — امن کا راگ چھڑا، صبحِ بہاراں آئی

آئی آواز "خزاں ہے تو خزاں کا کیا غم — آ رہی ہوں میں علاجِ غمِ دوراں لیکر
مرہم و نشتر و سامانِ جراحت کیساتھ — اک نیا دور نئے دور کا انساں لیکر

میرے نالوں میں شرر ایسے بھی ہیں شعلے بھی ہیں — آہنِ طوق و سلاسل کو پگھلنا ہو گا
آج تک ساتھ زمانے کا دیا ہے میں نے — اب مرے ساتھ زمانے کو بدلنا ہو گا

تیں نے زندانِ فرنگی کی نہیں کی پروا
توڑ کر اس قفسِ نو کو نکل آؤں گی

میرے آنے میں بہت دیر نہیں ہے یا ربا
میں اگر آنہ سکی آج تو کل آؤں گی

شاعری اشک فقط حسنِ حکایت نہیں!
بات سے بات نہ نکلے تو کوئی بات نہیں

برادرانِ تنگ دل

کبھی تو کھُل ہی جائے گا وہ رازِ عشق و عاشقی
چھپا ہوا ہے جو ابھی غبار افتراق میں
کبھی تو جان جائیں گے برادرانِ تنگ دل
کہ لطف زندگی ہے اتحاد و اتفاق میں

امن کا پیغام

عظمتِ انسانیت کا نام لے کر آئے ہیں
عزم نو میں رُوحِ استحکام لے کر آئے ہیں
عشق بے پایاں خلوصِ عام لے کر آئے ہیں
داروئے دردِ دل اقوام لے کر آئے ہیں
دوستو! ہم امن کا پیغام لے کر آئے ہیں

ہند کے سرسبز کھیتوں، مرغزاروں کی قسم
لہلہاتے سبزہ زاروں کی، بہاروں کی قسم
گنگناتے رقص کرتے آبشاروں کی قسم
مسکراتی صبح، ہنستی شام لے کر آئے ہیں
دوستو! ہم امن کا پیغام لے کر آئے ہیں

آئے ہیں ہم مشعلِ عرفاں جلانے کے لئے
آئے ہیں مستقبلِ انساں بنانے کے لئے
جنگ اور تخریب کا امکاں مٹانے کے لئے

صلح کی مئے، دوستی کا جام لے کر آئے ہیں
دوستو! ہم امن کا پیغام لے کر آئے ہیں

لائے ہیں شادابیاں دشت و بیاباں کیلئے
زندگی کی ندیاں صحرائے بے جاں کے لئے
دولتِ امن و اماں مزدور و دہقاں کے لئے

الغرض آغازِ خوش انجام لے کر آئے ہیں
دوستو! ہم امن کا پیغام لے کر آئے ہیں

ایٹم و ہائیڈروجن کے دیوی دیوتاؤں سے بچو
زندگی کے دشمنوں، جنگی خداؤں سے بچو
موت کے ذروں سے، مصنوعی دباؤ سے بچو

ہاں بچو ان سے جو زریں دام لیکر آئے ہیں
دوستو! ہم امن کا پیغام لے کر آئے ہیں

زر پرستی کا فسوں اب توڑ دینا ہے ہمیں
امن سے، ٹوٹے دلوں کو جوڑ دینا ہے ہمیں

جنگ کے سیلاب کا رخ موڑ دینا ہے ہمیں
ہم عنانِ ابلقِ ایّام لے کر آئے ہیں
دوستو! ہم امن کا پیغام لے کر آئے ہیں

کھول ہی ڈالیں گے ہم بند نقاب زندگی
جگمگائے گا فلک پر آفتاب زندگی
کھینچ لیں گے سرخ کرنوں سے شرابِ زندگی
پیر میخانہ سے اِذنِ عام لے کر آئے ہیں
دوستو! ہم امن کا پیغام لے کر آئے ہیں

زندگی کے گیت گائیں گی ملوں کی چمنیاں
چمنیوں سے ابرِ رحمت بن کے نکلے گا دھواں
وادئ ایمن بنے گا عالم برق و دخاں!
اشکِ ہم جنت بہر یک گام لے کر آئے ہیں
دوستو! ہم امن کا پیغام لے کر آئے ہیں

کوئل کی کوک

کوک ری کوئل! کوک

میں ہوں کوئل مشت پر مشہور ہے میری کوک
تو ہے انساں تیری فطرت سہو و خطا اور چوک
ناقص تیرا علم و ادب ہے، تیرا یقین مشکوک
حرف محبت عنقا ہے اور لفظِ جنوں متروک
کوک ری کوئل! کوک

بن کے پنچھی کیا دیکھیں مایا کا روپ انوپ
آم کی ڈالی پر نہ پڑے گی تیرے دھن کی دھوپ
دیکھ رہی ہوں دور سے میں انسان کا اصلی روپ
آنکھ میں آنسو، آہ لبوں پر اور جگر میں ہوک
کوک ری کوئل! کوک

سود و زیاں کی بستی میں ہے سیم و زر کا راج
عشق و محبت بے بس ہیں اور علم و ہنر محتاج
کوک تو آخر کوک ہے شاعر! دیکھ ہوا ہے آج
نغمۂ بلبل بارِ سماعت، جیسے روتے خوک
کوک ری کوئل! کوک

حرص و ہوس کی رقاصہ نے موت کا چھیڑا راگ
راگ، کہ جس کی تال پہ ناچیں کالے کالے ناگ
ناگ، کہ سم ہے جن کے تن میں اور دہن میں آگ
آگ، کہ جس سے بھڑکیں شعلے، اٹھے من میں ہوک
کوک ری کوئل! کوک

مکر، فریب اور جھوٹ کپٹ دنیا کا ہار سنگار
چلتی پھرتی لاشوں پر ہے مایا کا بازار!
بھوکی ننگی نگری میں ہیں دولت کے انبار
دولت کے انبار کے نیچے رینگ رہی ہے بھوک
کوک ری کوئل! کوک

کہانی میں پہیلی

(بچوں کے لئے)

آؤ سُنائیں ایک کہانی / ایک تھا راجہ ایک تھی رانی
رانی جیسے پریم کا دھارا / راجہ جیسے گھُپ اندھیارا
رانی جیسے ننھی گُڑیا / راجہ جیسے بِس کی پُڑیا!!
رانی جیسے سُکھ کا آنچل / راجہ جیسے دُکھ کی ہل چل
رانی جیسے رنگِ حنائی / راجہ جیسے دشت قصائی
رانی جیسے مور چمن میں / راجہ جیسے کالا بن میں
رانی کُٹیا میں دُکھ جھیلے / راجہ محلوں میں ڈنڑ پیلے
رانی بے چاری دُکھیاری / سب کچھ پاکر سب کچھ ہاری
راجہ محنت سے گھبرائے / کھائے، کھیلے حکم چلائے!
رانی بوئے اور اُگائے! / کاٹے چھانٹے ڈھیر لگائے

راجہ لشکر لے کر آئے　　　　لوٹے لا دے اور لے جائے

سن لی تم نے میری کہانی　　　　کہہ دو کون ہیں راجہ، رانی

بجھا بجھا اشکت ! ہیں بجھا

محنت رانی، دولت راجا

قطعہ

(اہلیہ عارف کے اقدام خودکشی پر)

جانتی ہو قید ہستی توڑ دینا جرم ہے

اب تمہیں مرمر کے جینے کی سزا دیجائیگی

موت کے پیالے کو چکنا چور کر دینے کے بعد

زندگی کا زہر پینے کی سزا دی جائیگی

دشتِ کربلا

درست ہے کہ ساقیا! وہ بیڑیوں کا سلسلہ
جو کل وبالِ جان تھا! وہ آج کٹ کے گر گیا
مگر یہ کیا غضب ہوا۔ یہ کس بلا کی ہے گھٹا
وہ منظرِ شفق ہے یا!! لہو کی آبشار ہے

یہ بات کیا ہے آج بھی گھٹی ہوئی ہے زندگی
کسان اور محنتی ہیں مبتلائے بے کسی
شریکِ حال ہے وہی! برہنگی و مفلسی
قدم قدم پہ موت کا سکوت و انتشار ہے

یہ اختلافِ رنگ و بو یہ امتیازِ ما و تو
یہ شور و شر یہ ہاؤ ہو عناصرِ فساد خو
کہو نہ پائیں کیوں نمو کہو نہ کیوں پئیں لہو
کہ شیطنت کا قہقہا ترنمِ ہزار ہے

وہی غریب کی فغاں نحیف اور ناتواں!
وہی امیر کی دکاں ہے کامیاب و کامراں
وہی جفائے حکمراں وہی زمین و آسماں
وہی ہے دشتِ کربلا وہی لہو کی دھار ہے

زندگی

یہ تری دنیا ہے یا زنداں ہے یا
حجرۂ ظلمات میں ہے روشنی
پنجۂ گلچیں میں شاخ گل ہے یا
موت کی آغوش میں ہے زندگی

مسافر کی عید

ہلالِ عید روشن ہے، منور سارا عالم ہے
وفورِ عیش و مستی ہے، لبالب ساغرِ جم ہے
مگر میں ہوں وطن کی یاد ہے اور چشم پُرنم ہے!
مسافر کے لئے یہ عید کا دن بھی شبِ غم ہے

کٹھن ہے راہ، منزل دور ہے، پاؤں میں چھالے ہیں
دلِ بیتاب میں حشرِ تمنا، لب پہ نالے ہیں
جہاں میں ہوں وہاں اے دل محرم ہی محرم ہے
مسافر کے لئے یہ عید کا دن بھی شبِ غم ہے

نہ بانگِ قلقلِ مینا، نہ دورِ جام و پیمانہ
نہ رقصِ ساقیٔ مہ وش نہ وجدِ پیرِ میخانہ
نہ زلفِ خم بہ خم ہے اور نہ چھاگل کی چھما چھم ہے
مسافر کے لئے یہ عید کا دن بھی شبِ غم ہے

یہاں اپنوں کی پرسش ہے نہ بیگانوں کی پروا ہے
حقیقت میں یہ دنیا زر کے دیوانوں کی دنیا ہے
جسے کوزہ میسّر ہے وہی چشمک زنِ جم ہے
مسافر کے لئے یہ عید کا دن بھی شبِ غم ہے

ہلالِ عید نے آخر بڑھا دی بے کلی دل کی !!
مسلسل آنسوؤں میں یاد ہے یارانِ محفل کی
غرض یہ ہے کہ میں ہوں اور گل و بلبل کا ماتم
مسافر کے لئے یہ عید کا دن بھی شبِ غم ہے
